پرتوِ جمال

(حکیم) محمد نبی خان جمال سویدا

پرتوِ جمال

(حکیم) محمدّ نبی خان جمال سویدا

مجلسِ یادگارِ اجملؒ (ناشر)
۵۵ - ایف ، گلبرگ ۲ ○ لاہور
آئینۂ ادب (تقسیم کار)
مسلم مسجد ○ انارکلی ○ لاہور

خطاطی : علی احمد صابر چشتی زرتاج رقم
جُزوی خطاطی : خالد جاوید یوسفی (متعلقہ کلام کے نیچے موصوف کا نام موجود ہے)
تزئین : بشیر احمد مُوجد
مطبع : فنون پریس

ناشر : مجلسِ یادگارِ اجملؒ
۵۵- ایف ، گلبرگ ۲ ، لاہور

تقسیم کار : آئینۂ ادب
مسلم مسجد ، انارکلی ، لاہور

تعداد : پندرہ سو
طبعِ اوّل : ۱۹۹۰ء
قیمت : اعلیٰ ایڈیشن (مجلد : ۲۰۰/- روپے
عام ایڈیشن : ۸۰/- روپے

اِنتساب

اپنی بیوی
مہر جہاں بیگم کے نام

لاہور ۱۹۹۰ء

سِیکھے ہیں اُسی ذات سے جینے کے قرینے
ہیں کون و مکاں مکتبِ فیضانِ محمد ﷺ

جمال سویدا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گو سخنہائے گفتنی تھے بہت
لکھنے بیٹھے تو مختصر نکلے

جمالیاتی وجدان کی شہ زوری فکر کے لیے مہمیز بنتی رہی، اِس طرح شعر گوئی کا سلسلہ جاری رہا۔ میرے محترم استاد سید وزیرالحسن عابدی مرحوم و مغفور کی دقیقہ رَس قوتِ تخلیق نے میری فکر کو جلا بخشی اور اسے پرواز کے قابل بنایا۔ اِس طرح رفتہ رفتہ "پرتوِ جمال" نے تکمیلی مراحل طے کر لیے اور گلستانِ آرزو میں ایک "گلِ نغمہ" اور کھِل گیا۔

قدیم روایات میرے خمیر میں شامل ہیں، قدیم تہذیب کے رچاؤ نے میرے خون کو دمکایا ہے اسی دمک سے میری فکر فروغ پاتی رہی۔

روایت کی حدود کو توڑ کر نکلنا میرے بس میں نہ تھا، ان حدود میں رہ کر اُس پار دیکھنے کے لیے نظر بنانی پڑی۔ اِس طرح جدید رجحانات کی پرچھائیاں بھی میرے اشعار میں ضم ہوتی رہیں ؎

سائے کی جستجو نے کیا منجمد ہمیں
ایسے تپے کہ دھوپ کی دیوار ہو گئے

مجھے نہیں معلوم میری یہ کاوش اہلِ ذوق کی نظر میں کیا رُتبہ پاتی ہے بہرحال میری طمانیت کے لیے شافی اور کافی ہے ـــــ شکر ہے یہ طمانیت "ناز" کا درجہ حاصل نہیں کر سکی، ممکن ہے اِس کا سبب میرا آبائی فن ہو:

اگلے انداز کی کچھ کہنہ روایات کے ساتھ
گیارہویں پشت سے اِس گھر کو طبابت کرتے

(حکیم) محمد نبی خان جمال سویدا
جہاں نما ۵۵/ایف، گلبرگ ۲ ـــــ لاہور

حمد

تُو ہی قادر تُو ہی خالِق ہے مِرے ربِّ عظیم
اَور لاَرَیبْ تیری ذات ہے رحمان و رحیم

اِس گنہ گار کو بخشِش کی تڑپ رہتی ہے
تیری رحمت کا طلب گار ہوں معبودِ کریم

لاہور ۱۵ ستمبر ۱۹۸۴ء

حمد

حمد ہے اُس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا   جان ڈالی خاک میں اُس خاک کو گویا کیا

روز و شب کا سلسلہ اک نظم سے جاری ہوا   شمس کو حرکت ملی اِمروز کو فردا کیا

آدم و حوّا اُتارے حق نے بر رُوئے زمین   نسلِ اِنسانی کی خاطر پھر انھیں یکجا کیا

معتدل رکھا فضا کو تاکہ اِنساں خوش رہے   دھوپ سے گرمی عطا کی، اَبر سے سایا کیا

نعمتیں دِیں لذّتِ کام و دہن کے واسطے   ہر شجر پر ہر مزے کا ہر ثمر پیدا کیا

گویا اِنساں خود ترقی کے منازل طے کرے   از زمیں تا آسماں ہر فکر کو جویا کیا

حمد ہے اُس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا   جان ڈالی خاک میں اُس خاک کو گویا کیا

لندن، بروز منگل، ۶ر ستمبر ۱۹۸۸ء

حمد

ذات ہے تیری قدیم ــ تُو ہے رحمان و رحیم
یا بصیر و یا قدیر ــ یا فہیم و یا علیم
وسعتِ ایں کائنات ــ حکمتِ دانا حکیم
مَیں ہُوں اِک بندہ حقیر ــ تُو ہے معبُودِ عظیم
مَیں مُسافر کم سمجھ ــ کوئی رستہ مستقیم
اور عبادت کے لیے ــ ہو عطا قلبِ صمیم
تیرا بندہ ہے جمالؔ ــ تُو ہے رحمان و رحیم

لندن، بروز جمعرات، ۱۱؍ اگست ۱۹۸۸ء

کتبہ

حمد

اِس عالمِ وجود میں ہر نقطہ اِک کتاب
ہر ذرّہ اپنی ذات میں اِک کائنات ہے

یہ وسعتِ نمو جو ہے، ذرّہ ہو کہ نقطہ
اُس پر محیط قادرِ مطلق کی ذات ہے

لاہور ۱۶ مارچ ۱۹۸۷ء

حمد

مومن کے دِل پہ نقش ہے جس ذات کی صِفات
چمکے ہیں جس کے وصف سے اسرارِ کائنات

اُس در پہ جب جُھکانے لگا اپنا سر جمالؔ
صرف اک جِہت میں ضم ہُوئے انوارِ شش جِہات

لاہور ۲۲ فروری ۱۹۸۲ سنہ ء

حمد

زمیں پر عرشِ اعظم کا گماں ہے
تصوّر میں یہ کس کا آستاں ہے
مشامِ جاں میں اُترے نور بن کر
یہ خوبی ہر گُلِ تر میں کہاں ہے
ہے شرطِ جبہ سائی دردِ پیہم
عبادت بے ریاضت رائگاں ہے
متاعِ سوزِ غم ملتی ہے کس کو
جو مِل جائے نشاطِ جاوداں ہے
وہی رستے پہ لائے گا سویدا
ہماری عقل کا جو پاسباں ہے

لاہور ۱۴ نومبر ۱۹۷۲ء

نعت

حاصل ہو جنہیں دولتِ عرفانِ محمّد ﷺ
ہوتے ہیں وہی رُتبہ شناسانِ محمّد ﷺ

توفیقِ ثنا پیکرِ خاکی میں کہاں تھی
یہ جلوۂ گفتار بفیضانِ محمّد ﷺ

اُس ذات کے پرتَو سے کِھلے پھول ہزاروں
صحرائے عرب بن گیا بُستانِ محمّد ﷺ

سیکھے ہیں اُسی ذات سے جینے کے قرینے
ہیں کون و مکاں مکتبِ فیضانِ محمّد ﷺ

یہ ارض و سما جُنبشِ ابرُو کا کرشمہ
یہ شمس و قمر سایۂ دامانِ محمّد ﷺ

ہیں عرش پر اُس نقشِ کفِ پا کی بہاریں
یہ شان، یہ توقیر، ہے شایانِ محمّد ﷺ

اُس لہجہ کا انداز بھی شامل ہے وحی میں
ہر آیۂ قرآں ہے زباں دانِ محمّد ﷺ

اِک ذرّۂ خاکی کہ تخلص ہے سویداؔ
خود را بشمارد زِ غلامانِ محمّد ﷺ

لاہور ، ۲۷۔ فروری ۱۹۸۰ء

نعت شریف

آپؐ کے دَم سے بُت ہیں پریشاں مشعلِ وَحدت ہوئی فروزاں
نُور کی مَوجیں ہرسُو فراواں طاری ہُوا ہے عالمِ وجداں

صَلَّی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّم

ذکرِ مبارک صبحِ بہاراں رُوئے مبارک شمع فروزاں
آپؐ نے بخشی رونقِ ایماں آپؐ کے دَم سے عظمتِ انساں

صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

آپؐ کے دَم سے ذرّے گلستاں بن گیا صحرا رشکِ بہاراں
سنبل و ریحاں مُشک بداماں زینتِ مومن نکہتِ ایماں

صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

آپؐ کا لہجہ آپؐ کا فرماں　　زخم کا مرہم دَرد کا درماں
وِردِ مُسلسل نُطق کا طُغیاں　　دے رہی ہے صَدا یہ تارِ رگِ جاں
صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

ذاتِ مُبارک حاصِلِ قرآں　　حسنِ اعظم رُوحِ دبستاں
لُطفِ عقیدت سینے میں پنہاں　　لب پہ سُویدا جاری و رقصاں
صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

لندن ، ۱۷ ؍ جولائی ۱۹۸۸ء　　کتبہ [illegible]

نعت

جا بجا ظُلمتوں کے ڈیرے تھے
ہر قدم پر بھٹک رہی تھی نگاہ
تُو نے ہر مرحلے پہ روشن کی
مشعلِ لا الٰہ الا اللہ

۵۔ جولائی سنہ ۱۹۷۲ء

نعت

جو تیرے رُخ سے ہمہ رنگ اِک شعاع نِکلی
یہی شعاع تو ہر زندگی کا حاصِل تھی

اِسی شعاع کا ہم سَب پہ ہو رہا ہَے کرم
اِسی کے سائے میں، تزئینِ ہر حیات ہوئی

لاہور، ۲- اپریل سنہ ۱۹۸۷ء

نعتؐ

جس کے قدم کے نقش چمکتے ہیں عرش پر
اُس کے لیے مقامِ فروتر تھی کائنات

اُترے بلندیوں سے جو رُوئے زمین پر
مقصود تھی درستیٔ احوالِ ذی حیات

لاہور ۲۸ جنوری ۱۹۸۲ء

حضرت حسین علیہ السلام

اِک عالمِ گداز تھا عزمِ حُسین میں
گُزرے جو کربلا سے نکھر آیا حُسنِ ذات

تھا جلوۂ جمالِ شہیداں کا اہتمام
ہر تشنہ لب کے سامنے بہتا نہیں فرات

لاہور ۳۱۔ مارچ ۱۹۷۶ء

پَرتَو

مرا سینہ ہے بستی مقبروں کی
مرا سرمایہ یادِ رفتگاں ہے
مرے افکار کی ضَو میں سویدا!
مرے اجداد کا پَرتَو عیاں ہے

کراچی ۱۳- اپریل سنہ ۱۹۷۴ء

○

وہی رہروی، وہی بیخودی، وہی بندگی میں جنون سا
کوئی سنگِ راہ جہاں مِلا، وہیں بڑھ کے سر کو جُھکا دیا

یونہی بے اِرادہ جو اُٹھ گئی، کِسی شاخِ گل کی طرف نظر
تو فضا میں شعلے بھڑک اُٹھے، ابھی آشیانہ بنا نہ تھا

وہی زہرِ غم وہی تلخیاں، وہی ظلمتیں، وہی سختیاں
وہی اِک شرارہ اُمید کا، کبھی جل اُٹھا، کبھی بُجھ گیا

ترے وحشیوں کے یہ مرتبے، وہ قدم جِدھر سے گزر گئے
وہیں ایسے گہرے نِشاں پڑے، وہی جادہ بنتا چلا گیا

نہ وہ قافلے، نہ وہ رہگزر، نہ وہ منزلیں، نہ وہ راہبر
وہی اِک تحیّرِ جستجو، جو غبار بن کے اُڑا گیا

یہ جمال تیری تلاش میں کہ فراز سے تھی فراز تک
جو گِرا تو گِرتا چلا گیا، نہ قدم جمے، نہ سنبھل سکا

پشاور، ۲۴- جولائی ۱۹۷۳ء

○

فروغِ فکر سے بینائی میں یہ ضعف آیا ہے
نظر آتی ہے ہر صُورت میں اِک صُورت خرابی کی

○

مسافر چار دِن کا میہماں ہے
مگر دِل میں متاعِ جاوداں ہے
سمجھتے ہیں جسے ہم داغِ لالہ
ثباتِ موسمِ گل کا نشاں ہے
جلاتی ہے جو بجلی آشیاں کو
وہی وجہِ نمودِ آشیاں ہے
صبا! صحرا نشینوں سے یہ کہیو
چمن میں نکہتِ گل رائگاں ہے
تری آنکھوں کے حلقوں میں سویدا
جو شمعیں بجھ گئیں اُنکا دھواں ہے

لاہور ، جنوری ۱۹۷۴ء

○

اِسقدر فکر کو گہرا نہ کریدو کہ کہیں — تمکو بھولے ہوئے اَصنام نظر آجائیں
اِن فضاؤں میں اگر مستیٔ صہبا ہو جمال — رقص کرتے ہوئے کچھ جام نظر آجائیں

○

ڈھونڈتا ہے جسے ، نایاب ہے ملتا کم ہے
یا سویدا تیری بینائی کا حلقا کم ہے

مجھ سے خود اپنی حقیقت مرے محبوب نہ پوچھ
تجھ سے الفت ہے بہت اسلیے سوچا کم ہے

تیری زلفوں میں تو اشکوں نے پروئے موتی
اپنی آشفتہ مزاجی کو سنوارا کم ہے

تیری تصویر کو مدت سے لیے بیٹھے ہیں
یہ الگ بات ہے ہم نے تجھے دیکھا کم ہے

جس کو خواہش ہو نئی راہ بنانے کی جمال
ایسا راہی کسی رستے سے گزرتا کم ہے

لاہور ، ۱۹ جنوری سنہ ۱۹۷۸ء

○

ساحل سے گزرتی ہوئی لہروں کے مصوّر! خوش رنگ سی تصویر بنا کیوں نہیں دیتے
یہ قصر نشیں زعمِ امارت میں سویدا دِیوار سے سائے کو ہٹا کیوں نہیں دیتے

مری ۲۳ جولائی سنہ ۱۹۷۷ء

○

گُلوں کا عکس فروزاں تھا دیدۂ تر میں
خوشی کی بات تھی اور آگ لگ گئی گھر میں

فضائے شوق کے قوسین جب نظر آئے
ہزار بُت کدے رقصاں تھے ایک منظر میں

جنونِ عشق میں شوریدگی بھی جذب ہُوئی
اُٹھایا سنگ تو دِیوار بن گئی سَر میں

صدف کے جوف میں یہ کس کا نُور ہے تاباں
کہاں سے آئی ہے یہ آب و تاب گوہر میں

بہارِ علم کا جوہر ہے عابدیؔ[1] میں جمالؔ
عجیب رنگ کی خوشبُو ہے اِس گُلِ تر میں

لاہور ، ۱۱۔ نومبر ۱۹۷۲ء

○

راز بن کر اِس جہاں سے جو بھی دِیوانے گئے
اپنے اپنے نقشِ پا سے خُوب پہچانے گئے

○

[1] سید وزیر الحسن عابدی مرحُوم

○

تُو نظر کی پہنچ سے باہر ہے — پھر بھی اِک جستجو برابر ہے
نیم جاں پھُول، ناتواں شاخیں — جیسی بینائی، ویسا منظر ہے
سوچتے سوچتے ہُوا محسوس — یہ زمیں بھی ہمارے سَر پہ ہے
ہاتھ میں سنگ، آنکھ میں شعلے — یعنی دِیوانہ راستے پر ہے
کھا کے ٹھوکر جو تم گِرے ہو جمالؔ
جانے کِس بتکدے کا پتھر ہے

مری ۲۱ - جولائی ۱۹۷۷ء

○

آتے تھے اِس دیار میں دَم بھر کے واسطے
دامن کا اپنے چاک سِیا اَور گزر گئے

جیسے کوئی بلا تھا ہمیں راہ میں جمالؔ
جُھک کر یونہی سلام کیا اور گزر گئے

لندن ۲۸ - مئی ۱۹۷۸ء

○

وسعتِ دشت میں یہ دیوانے
ڈھونڈتے ہیں کسے خدا جانے

دِل میں گنجائشیں بہت کم تھیں
ورنہ اپنے تھے سارے بیگانے

چشمِ میخوار سے گزرتے ہیں
تشنگی میں ہزار میخانے

جن کو ہم طول دیتے پھرتے تھے
مختصر ہو گئے وہ افسانے

تپتے صحرا کے ایک پتھر پر
کون آئے گا پھول برسانے

تشنہ کاموں کی جنبشِ لب سے
ٹوٹ جاتے ہیں لاکھ پیمانے

اپنی صورت سے اجنبی ہو جمال
شہر میں کوئی کیسے پہچانے

لاہور ، ۱۲- دسمبر ۱۹۷۳ سنہ ء

○

گرد دُھل جائے تو پھر دِل کا یہ اندازہ ہے
شاخِ اُمید کا ہر پھُول ابھی تازہ ہے
کیا ضرورت اُسے آرائشِ و زیبائش کی
حُسنِ سادہ کے لیے شرم وحیا غازہ ہے
مختلف ظرف کے میخوار ہیں میخانے میں
کِسقدر کون پئے گا، کِسے اندازہ ہے
پیچھے پیچھے مرے چلتے ہوئے بازار کا شور
اگلی تہذیب کے پِندار کا آوازہ ہے
جس کو تم قصر کی بنیاد سمجھتے ہو جمالؔ
جِتنی دیواریں ہیں اُن کا یہی دروازہ ہے

لاہور ۲۰۔ مئی ۱۹۸۰ء

○

قصر جن کے بلند و بالا تھے خود وُہ اپنی ہَوا میں اُڑتے رہے
جذبۂ جُستجو میں خامی تھی راستے گھر کی سمت مڑتے رہے

○

یہ ہُوا تیرے مُسکرانے سے
سُرخیاں بڑھ گئیں فسانے سے
دُور ہوتی چلی گئی منزل
ہر طرف راستے بنانے سے
روشنی کا وقار گرتا ہے
آندھیوں میں دِیے جلانے سے
ظلمتِ غم میں، غم کے سائے بھی
خُوب چمکے نظر جمانے سے
حلقۂ فِکر ٹوٹ جاتا ہے
بے سبب دائرے بنانے سے
وضع تیری نہ مِل سکے گی جمالؔ
اِس نئی وضع کے زمانے سے

لاہور، ۲۱۔ فروری سنہ ۱۹۷۶ء

○

شیشۂ دِل کا ان آنکھوں سے تعلق کیا ہے
حیرتیں اپنے ہی پندار کی شیدائی ہیں

○

مُبارک ہو سعادت اُس حرم میں بار پانے کی
خدا توفیق دے ، سر کو جھکا کر بھول جانے کی

خس و خاشاک چُنتے پھر رہے ہیں صحنِ گلشن میں
کہ دِیوانوں میں خُو پیدا ہوئی ہے گھر بسانے کی

مری صُورت سے میرے دِل کا غم کیسے عیاں ہوگا
مرے ہونٹوں کو عادت پڑگئی ہے مُسکرانے کی

کہاں گرتی ہے بجلی دیکھتے پھرتے ہیں دیوانے
کہ بھُول آئے کہیں بنیاد رکھ کر آشیانے کی

کِسی نسبت سے جن کو سر جُھکانے کی تمنّا تھی
جبیں پر خاک ہی ملتے رہے اُس آستانے کی

مجُھے اپنے قفس کی تیلیاں کیوں یاد آتی ہیں
کہیں دِیوار گِرتی دیکھ کر دِیوانخانے کی

سویدا ٹوٹ سکتی ہے ، طلسمِ شب کی خاموشی
ضرورت ہے کِسی تصویر کو گویا بنانے کی

کراچی ۱۰- جنوری ۱۹۷۷ء

○

خُود اپنی ہی تلاش رہی عمر بھر مجھے
کِس رہگزر میں چھوڑ گیا راہبر مجھے

بُجھتے رہے امید کے ہر گام پر چراغ
ظُلمت میں کھینچ لائی تلاشِ سحر مجھے

زندانِ آرزو سے نِکالا جو یاس نے
حسرت سے دیکھتے رہے دیوار و در مجھے

حرکت سے باز رکھتی ہے آسائشِ حیات
پتّھر بنا رہا ہے، یہ شیشے کا گھر مجھے

ہر عزمِ رہروی پہ اُبھرتے ہیں سو نشیب
در پیش ہے جمالؔ عجب رہگزر مجھے

لاہور ۱۲۔ دسمبر ۱۹۷۱ء

○

بھڑکتا ہے بدن ٹھنڈی ہَوا سے — نہ جانے کِس بَلا کی تشنگی ہے
مری پلکوں پہ بوندیں آنسوؤں کی — جِگر کی آگ شبنم بن چکی ہے

○

ہر گامِ آرزو پہ نئے آستاں ملے
کتنے خدا بناؤں کہ تیرا نشاں ملے

ذروں کو توڑتے پھرے، اس اشتیاق میں
ممکن ہے کائنات کا سرِ نہاں ملے

نکلے حدودِ باغ کی بندش سے کس طرح
یہ آرزو کہ دشت میں سروِ رواں ملے

اِک آرزوئے شوق ہے تاب و تواں کہاں
میرا سلام کہیو صبا وہ جہاں ملے

مِل بیٹھیں دو گھڑی کہیں احبابِ ہم خیال
دِل کو سکوں نصیب ہو لطفِ زباں ملے

اِک عمر جستجو رہی اِس باغ میں جمالؔ
تھی جس کی آرزو ہمیں وہ گل کہاں ملے

پشاور / لاہور ۱۹- اپریل ۱۹۸۴ء

○

خواہشوں سے نجات کیسے ملے
ترکِ دنیا بھی ایک دُنیا ہے

لندن ۷- اگست ۱۹۷۶ء

○

تیرگی سے جو ہم ڈرے ہوں گے
اپنے اعمال سامنے ہوں گے

کس قدر خستگی ہے اعضاء میں
کس بلندی سے ہم گرے ہوں گے

کیا خبر کل بساطِ ہستی پر
قصر ہوں گے کہ مقبرے ہوں گے

آرزوئے قرارِ دل کے لیے
بے قراری کے سلسلے ہوں گے

فاصلوں میں بھی قربتیں ہیں اگر
قربتوں میں بھی فاصلے ہوں گے

میری گم گشتگی کی غیرت سے
ہر طرف راستے بنے ہوں گے

اب جو بے حس بنے پڑے ہیں جمالؔ
سنگ بھی راستہ چلے ہوں گے

لاہور، ۲۔ فروری سنہ ۱۹۷۲ء

○

ارزانیِ عصیاں سے بشر نوحہ کناں تھا
خود ہم سے زیاں کار کو احساسِ زیاں تھا
اُجڑے ہوئے اِس باغ پہ جب گہری نظر کی
ہر شاخ پہ خود اپنے ہی ہاتھوں کا نشاں تھا
رستوں میں سمانے لگی جب منزلِ مقصود
اُس وقت خدا جانے کہ وہ راہی کہاں تھا
چمکی ہوئی تھیں نقشِ کفِ پا کی بہاریں
جب سر کو جھکانے لگے ہر سمت دھواں تھا
شاعر تھا بہت خوب، تخلص تھا سویدا
یہ جرم تھا اُس شخص کا، وہ اہلِ زباں تھا

لاہور ۲۸ دسمبر ۱۹۸۱ء

○

جنکو خواہش ہے وہ ہوائیں اُڑیں اپنی بے بال و پَر گزرتی ہے
منظروں میں تیر کر ہر رنگ دیکھ آیا جمال
کچھ نہیں دُنیا میں تیری مسکراہٹ کے سوا

○

زِنداں وہی ہے رونقِ دیوار و دَر نہیں
زِنداں نشیں میں تابشِ فکر و نظر نہیں
ہر شخص اپنی ذات میں گم ہو کے رہ گیا
اِس دَور میں کِسی کو کسی کی خبر نہیں
حَلقہ سا اِک بنائے ہوئے ظلمتوں کے گرد
رنگِ طلوعِ غم ہے نمودِ سحر نہیں
بدنام میری ذات فسادِ خرد سے ہے
مُجھ پر جو تہمتیں ہیں مری ذات پر نہیں
ہے بے ثبات دِل میں جو عالم ثبات کا
یہ مُوت بھی جمالؔ ابھی معتبر نہیں

لاہور ۱۶ ستمبر ۱۹۷۵ء

○

راستے مستقیم ہونے تک زندگی درمیاں نہ آ جائے
اِس زمیں کی کشِش قیامت ہے زیرِ پا آسماں نہ آ جائے

پشاور ۶ دسمبر ۱۹۷۷ء

○

موسم کے ساتھ پھُول جو معدُوم ہو گئے
رگ رگ میں اپنی یاد کے کانٹے چبھو گئے

طغیانیوں میں پار لگاتے تو بات تھی
یہ کیسے ناخدا تھے کہ کشتی ڈبو گئے

سائے کی جستجو نے کیا منجمد ہمیں
ایسے تپے کہ دُھوپ کی دیوار ہو گئے

آنکھوں نے جو چُرائے تھے رُخسار یار سے
اِس غم کی تیرگی میں وہ آئینے کھو گئے

کِس کِس کے دیکھنے کو ترستا رہا جمالؔ
واپس نہ مڑ کے آسکے دُنیا سے جو گئے

لاہور ۱۳ مارچ ۱۹۷۵ئ

○

یاد آئی تھی خوش جمالوں کی　　کہکشاں بن گئی خیالوں کی
جب منور ہُوا حرم کا چراغ　　روشنی بجھ گئی شوالوں کی

○

کِس قیامت کے فضاؤں میں اُبھر آئے تھے رنگ
چمپئی جسم میں رقصاں تھیں سنہری راتیں

فرطِ جذبات سے گویا تھے شہابی رخسار
سُرخ ہونٹوں پہ لرزتی تھیں اُدھوری باتیں

لاہور، ۱۱ دسمبر سنہ ۱۹۷۲ء

○

زہرِ خرد سے جوہرِ آئینہ مر گیا
چلیے! وہ نازِ غیرتِ اہلِ نظر گیا
یہ کون سے مقام پہ جامد ہوئی تلاش؟
یہ کس کا دَر بلا ہے کہ دورانِ سَر گیا؟
ہر گام جس کا منزلِ مقصود تھا کبھی
راہی وہی ہے جذبۂ عزمِ سفر گیا
شہروں میں ڈھونڈتی پھری ماضی کی آبرو
جسموں کے اِس ہجوم سے اِنساں کدھر گیا
جُھرمٹ میں سبز پتوں کے قایم تھی آبرو
اِس پیرہن سے پھُول نکل کر بکھر گیا
طُوفانِ زندگی کے حوادث میں اے جمالؔ
جو دم گزر گیا، وہ غنیمت گزر گیا

لاہور، ۲۷ دسمبر ۱۹۷۴ء

○

اُلجھے ہوئے ہیں نقشِ کفِ پائے یار میں
ورنہ فلک سے خوشۂ انجم اتارتے

○

گُل ہنسے رنگِ اعتبار گیا
اِس طرح موسمِ بہار گیا

نکہتوں میں لطافتیں تھیں بہت
غُنچہ غنچہ قبا اتار گیا

سر رہے گا یونہی وبالِ دوش
قصّۂ راہ و رسمِ دار گیا

دشتِ کون و مکاں ہُوا تسخیر
عرش کی سمت اِک سوار گیا

ایک رہرو کی جُستجو میں جمالؔ
دُور تک راہ کا غبار گیا

لاہور ، ۱۱- نومبر ۱۹۷۵ء

○

نکہتِ زُلف کا پیغام تو پہنچے مُجھ تک
میری آشفتہ مزاجی بھی سَنور جائے گی

اِک نقطہ میں سمیٹے ہُوئے بیٹھا ہے جمالؔ
یہ نظر آپ کے آنے سے بکھر جائے گی

○

ہمیشہ اُس بتِ کافر کی دیکھی ایک ہی صُورت
فضا تبدیل ہو شاید نکل آئے نئی صُورت

بہت سی کروٹیں لیں آفرینش کی لطافت نے
بہت مشکل سے اِک انساں کی اِنساں سے مِلی صُورت

ہزاروں رنگ کے نقطے اُبھر آئے تصوّر میں
اِنہی نقطوں کے مِلنے سے بنے گی آپ کی صورت

ہمارے ہم نشیں ابتک ہمیں پہچان لیتے ہیں
تعجب ہے کہ زیرِ آسماں قائم رہی صُورت

قیامت تھی سویدا رہروی راہِ محبّت کی
ہزاروں موڑ کاٹے پھر مسافر کی بنی صُورت

لندن ، ستمبر ۱۹۷۶ء

○

ہم جنھیں سائے کی طرح سمجھے چھُو کے دیکھا تو آدمی نِکلے
خون کے رشتے جب کبھی ٹوٹے جوڑتے وقت اجنبی نِکلے

○

رفتہ رفتہ نکل آئے گی کچھ ایسی صُورت
دِل کے آئینے میں بن جائیگی اُسکی صُورت
خود بخود رنگ کہیں سمٹے، کہیں پھیل گئے
آپ کیا بگڑے کہ تصویر کی بگڑی صُورت
ہر طرف دَوڑنے پھرنے میں خرابی ہے نہاں
گھر ہی بیٹھو تو نکل آئے گی گھر کی صُورت
خوشبُو بنکر مری رَگ رَگ میں اُتر جاتی ہے
دیکھنے کو کبھی مِل جائے جو اچھی صُورت
کون سے دَور میں اُس گُل کی طرف دیکھا تھا
کِس زمانے سے سویدا تری بدلی صُورت

لاہور، مارچ ۱۹۸۳ء

○

اس باغ کی خوش رنگ فضا بھا گئی مجھ کو چمپا کی گھنی چھاؤں میں نیند آ گئی مجھ کو
کچھ خون کے دھبّوں کی گھلاوٹ تھی شفق میں یہ دُور کا منظر تھا، کسی نے نہیں دیکھا

○

رو برو ہو کر وہ شرمائے بہت
یک بیک رِشتے نکل آئے بہت

گو بظاہر دشت میں تنہا تھے ہم
دِل کے ہنگاموں سے گھبرائے بہت

پھُول تو دو چار ٹوٹے تھے مگر
پرتوِ گلچیں سے مرجھائے بہت

دشت میں دِیوار تو کوئی نہ تھی
اپنے ہی سائے سے ٹکرائے بہت

مسئلے سادہ تھے رسمِ عشق کے
آپ کی زُلفوں نے الجھائے بہت

تشنگی اپنی جگہ قائم رہی
بے خودی نے جام چھلکائے بہت

زِندگی کے مختصر غم بھی جمالؔ
اِس اندھیرے میں نظر آئے بہت

لاہور ، ۱۰- فروری ۱۹۷۶ء

○

○

دِل ہنسے تو زندگی باغِ اِرم سے کم نہیں
صرف ہونٹوں کے تبسّم میں شکستِ غم نہیں
یوں بظاہر دوستو! ہم ایک آتے ہیں نظر
فکر کی گہرائیوں میں رابطے باہم نہیں
ہلکی ہلکی بوندیوں میں لُطف ہے برسات کا
ٹوٹ کر برسے جو بادل پھر کوئی موسم نہیں
زِندگی بھی ایک ہنگامہ ہے ہست و بُود کا
ہم بھی اِس محفِل میں ہیں موجُود لیکن ہم نہیں
جل اُٹھا آسائشِ ہستی کا ہر پہلو جمالؔ
اس چمن میں شعلۂ گُل ہے مگر شبنم نہیں

تہران ، ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء

○

مِلا جب آستاں اس کا تو اپنا سر نہیں مِلتا
قریب آنے سے ربطِ سلسلہ اکثر نہیں مِلتا
چمن کی دلکشی محدود ہے چشمِ سویدا تک
نظر کی وسعتوں کے سامنے منظر نہیں مِلتا

لاہور ۲ نومبر ۱۹۷۵ء

○

اِس دُنیا کے بارے میں، کچھ سوچ رہا ہُوں، سوچنے دو
پہلے کیا تھی، اب یہ کیا ہے، خود مَیں کیا ہُوں، سوچنے دو
آخر پہلے حیوانوں میں، مِل جُل کر اِک ساتھ رہا
رفتہ رفتہ کیسے مَیں انسان بنا ہوں، سوچنے دو
دُنیا کے اِک گوشے میں، اِس سر کو جھکائے بیٹھا ہُوں
مدّت کی یہ عادت ہے، کچھ سوچ رہا ہوں، سوچنے دو
ویسے اِک اِک گام زمیں پر، خُوب سنبھل کے رکھا ہے
فِکر کی ہر گہرائی میں کیوں گرجاتا ہوں، سوچنے دو
اپنے کُچھ احباب سویدا راہ میں گردِ راہ ہوئے
میں خود بھی، اِنہی رستوں پر اِک عمر چلا ہوں، سوچنے دو

لندن ۲۹-اگست ۱۹۸۵ سنہء

○

بس یونہی اپنی جگہ، صرفِ وفا ہونے دو
سجدہ گاہوں سے جبینوں کو اُٹھاتے کیوں ہو

○

دشت بن جائے گلستاں کی طرح ہم نظر آئیں باغباں کی طرح
میری محرومیوں کا حال نہ پُوچھ دِل گرفتہ ہوں بے زباں کی طرح
جو سمجھتے ہیں زِندگی کو سفر گھر میں رہتے ہیں میہماں کی طرح
ہر گھڑی میرے ساتھ رہتا ہے ایک سایہ سا پاسباں کی طرح
دَرد گھر کر چکا ہے رَگ رَگ میں زِندگانی ہے زخمِ جاں کی طرح
تپتے صحرا میں بستیوں سے دُور اَبرِ غربت ہے سائباں کی طرح
اِس نئے دَور میں تبسم بھی ہے اُبھرے زخم کے نشاں کی طرح
کچھ دِنوں گھر سمجھ کے رہ جائیں کوئی گوشہ ہو آشیاں کی طرح
دِل کی گہرائیوں میں جب اُترے ہم نظر آئے آسماں کی طرح

باغ میں ڈھونڈتا رہا ہے جمالؔ
کوئی غنچہ بہارِ جاں کی طرح

لاہور ۲۲ فروری ۱۹۷۳ء

○

اِس شہر کی تیرہ راتوں میں، آبادیٔ شب جب بڑھتی ہے
ہر گھر کی دیواروں پر کچھ سائے گھومتے پھرتے ہیں

○

باغ میں پھول جب کھلا ہوگا باغباں ہاتھ مل رہا ہوگا
تیرا دیوانہ تیری محفل سے سایہ بن کر گزر گیا ہوگا
چھوڑ کر جسکو آئے تھے ہم لوگ باغ وہ بھی اجڑ گیا ہوگا
اور اُلجھے گا کاروبارِ حیات اِس قدر آگہی سے کیا ہوگا
تیری خود بینیوں کی کثرت سے آئینہ ٹوٹ کر گرا ہوگا
رفتہ رفتہ فسانۂ ہستی سرخیوں میں سمٹ گیا ہوگا
شہر میں ہر غریب سوداگر دِل کا آئینہ بیچتا ہوگا
وسعتِ دشت میں وہ دِیوانہ دھُوپ اوڑھے ہوئے کھڑا ہوگا
ماندگی سے جمال رہرو کی
راستہ گھر کو مڑ گیا ہوگا

لندن ۳۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء

○

○

سوز و گدازِ عشق سے ہم خاک ہو گئے
ایسے بھی آدمی تھے کہ پتھر بنے رہے
آتی تھی جنکے سانس سے مہر و وفا کی بُو
ہر راستے میں ایسے کئی اجنبی ملے
دراصل فرطِ تشنہ لبی کا ثبوت ہے
چھوڑ آئے میکدے میں پیالے بھرے ہوئے
شمس و قمر بھی پھرتے ہیں جن کی تلاش میں
وہ آشنائے رازِ جنوں کس طرف گئے
بے رنگیٔ حیات کا شکوہ نہیں رہا
جتنے بھی رنگ تھے ترے دامن میں بھر دیے
واماندگی بھی عشق میں رفتار دے گئی
پیچھے ہٹے ہم ایسے کہ آگے نکل گئے
شہروں میں ڈھونڈتی پھری ماضی کی آبرو
جسموں کے اس ہجوم سے انساں کدھر گئے
یہ بھی ستم ظریفیٔ تہذیب ہے جمالؔ
ہم وحشیوں کے واسطے شیشے کے گھر بنے

لاہور، ۱۹ فروری سنہ ۱۹۷۶ء

○

شاخِ گُل پر کوئی نشاں نکلے — برق نکلے کہ آشیاں نکلے
بڑھ گئی سوزِ غم کی ارزانی! — دل کے سودے بہت گراں نکلے
نوکِ ہر خار سُرخ رو دیکھی! — بے نشانوں کے کچھ نشاں نکلے
کاوشوں کا یہی تقاضا ہے — سعیِ حاصل بھی رائگاں نکلے
اُن کی عُریانیوں پہ ہنستا ہوں — سات پردوں میں جو نہاں نکلے
جانے کیا سوچ کر یہ دیوانے — تیرے کوچے سے ناگہاں نکلے
سوچنا چاہا، سوچ لے ڈوبی — بولنا چاہا، بے زباں نکلے
مجھکو مارا مرے تصور نے! — آپ ایسے حسیں کہاں نکلے

ہم سویدا فراق کے مارے
اپنے سائے سے بدگماں نکلے

لندن، ۲۶-اگست ۱۹۷۴ء

○

ہم ہیں محتاج زندگانی کے — زندگانی کو ہم سے کیا حاصل

○

موجِ ہوائے عشق سے عُقدہ یہ وا ہُوا
گویا قبائے گُل کی طرح تھی قبائے دوست

○

رَبط ہے اپنے دیدۂ تَر سے کیا تعلق ترے سمندر سے
زِندگی اپنی صاف اور سادہ چند اَوراق ہیں مُصوّر سے
کرب کی سلوٹیں ہیں چہرے پر آدمی مَر چکا ہے اندر سے
طُول کو اپنے ناپتا ہی رہا جو بھی گزرا مِرے برابر سے
آخری سِین ہے تماشے کا سرخیاں اُڑ رہی ہیں منظر سے
دُور ہوتے چلے گئے ہو جمالؔ
گھر میں رہ کر بھی اپنے ہی گھر سے

لندن ۲۰۔ جولائی ۱۹۸۰ سنہ ء

○

کوئی دِیوار ہلائے سے بھی جب ہل نہ سکی
سعیٔ جنبش کے لیے سائے نے بڑھنا سیکھا

لندن ۳۔ جولائی ۱۹۷۶ سنہ ء

○

دِل کا اساس بن گئی ہر خواہشِ حیات
مُجھ میں بھی گُل کِھلا گیا رنگِ فریبِ ذات

بادِ خزاں کے شور کو سمجھا نہیں کوئی
ہر برگِ خشک نے کہی مجنوں کے دِل کی بات

سازش کیے ہوئے تھی اندھیروں سے روشنی
نِکلا جو چاند اور بھی نِکھری اندھیری رات

تیرے لبوں پہ مُہرِ وفا ثبت کر چلے
یہ جانتے ہوئے بھی کہ دُنیا ہے بے ثبات

اُبھرا ہے اُس کی شکل کا اِک عکس سا جمالؔ
یہ وصفِ آئینہ ہے کہ حُسنِ تخیّلات

لاہور ۵۔ دسمبر ۱۹۷۵ء

○

بزمِ ماتم ہے، میلے ٹھیلے ہیں زندگی کے بڑے جھمیلے ہیں
تم سے مِل کر بھی یہ ہُوا محسوس جیسے ہم آج بھی اکیلے ہیں

○

وحشت سما گئی ہے دِلِ شعلہ کار میں
جی چاہتا ہے آگ لگا دوں بہار میں

یہ ہجر اور کاوشِ چشمِ وفا پرست
موتی پرو دیے ہیں گریباں کے تار میں

نکلے نہ اپنی ذات سے باہر تمام عمر
ڈھونڈا کیے قرار دلِ بے قرار میں

مَوجِ بہار آئے تو شفّاف ہو فضا
ہم کھو گئے ہیں راہ کے گرد و غبار میں

اتنی تو کم ہو ظلمتِ زندانِ آرزو
محسوس کوئی فرق ہو لیل و نہار میں

ہر راہرَو کو شوخیٔ رفتار مِل گئی
کیا جُنبشیں ہیں نقشِ کفِ پائے یار میں

ہر بُت کے دِل میں اُترو تو آئے نظر جمال
اُلجھے ہوئے ہو چہرے کے نقش و نگار میں

لاہور ۱۷ مئی ۱۹۷۴ء

○

○

تیری تصویر میں ہر پھول کی خوشبو بھرتے
عمر بھر پھر تری تصویر کو دیکھا کرتے

خیر گزری کہ اندھیرے میں کٹی عمرِ عزیز
صبح ہوتی تو ہم اندیشۂ شب سے ڈرتے

اگلے انداز کی کچھ کہنہ روایات کیساتھ
گیارھویں پشت سے اِس گھر کو طبابت کرتے

ہنستے ہنستے تری آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکا
ہم اگر ہوتے تو اس قطرے میں دریا بھرتے

ناپتے ہی رہے ہم طُولِ بیاباں کو جمالؔ
دِل میں وحشت تھی بہت اِسکے سِوا کیا کرتے

لاہور ۲ مارچ ۱۹۷۷ء

○

نا اُمیدی ابھی بیمار کے دِل میں نہ اُتر جان، پڑ جائیگی اُمید کی تابانی سے
ایسے ہنستے ہوئے غنچوں کی ضرورت ہے جمالؔ
جن کی تاثیر سے صحرا میں بہار آجائے

○

اگر ٹھہرے تو اَب کس کے لیے دورِ زماں ٹھہرے
ٹھہرنا تھا جنہیں وہ بزمِ دُنیا میں کہاں ٹھہرے
مِٹی تہذیب کے پَرتو میں گویا جان باقی تھی
زبانیں مختلف تھیں پھر بھی ہم اہلِ زباں ٹھہرے
قرارِ دل کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہیں صحرا میں
ذرا ہم سانس لیں، کچھ دیر سر پر آسماں ٹھہرے
جہاں تک یاد آتا ہے، ہم اپنی دھن کے پکّے تھے
چلے تو عزمِ منزل تھا، خُدا جانے کہاں ٹھہرے
ابھی تک ناپتا پھرتا ہے طولِ راہِ ہستی کو
نظر منزل پہ ہو تو زندگی کا کارواں ٹھہرے
سویدؔا چلتے چلتے پاؤں پتھر بنتے جاتے ہیں
یہ ممکن ہے ہماری ذات منزل کا نشاں ٹھہرے

لندن، اگست سنہ ۱۹۸۰ء

○

اِس دِل میں ترے حُسن کی روشن تھیں شعاعیں
یکتائی کی کثرت سے یہ آئینہ بنا تھا

○

شکوہ ہے کسی سے نہ شکایت ہے کسی سے
سب رنجشیں وابستہ ہوئیں اپنے ہی جی سے
ہر لمحہ گلوگیر رہی تلخیٔ ایام!
اک سانس بھی ہم لے نہ سکے اپنی خوشی سے
پژمردہ ہوئی جاتی ہے کیوں کھِلنے سے پہلے
کیا راز کہا پھول نے منہ بند کلی سے
دیواریں گرا دے گا یہ خمیازۂ وحشت
رستہ نہ ملا دشت کا جو تیری گلی سے
اتنا ہمیں خودسر نہ بنا غیرتِ پندار!
بیزار نہ ہو جائیں کہیں اپنی خودی سے
غربت میں کبھی وقت یہ آتا ہے سویدا!
آنسو نکل آتے ہیں تونگر کی ہنسی سے

لاہور، ۲۔ فروری ۱۹۷۲ء

○

فضائے عشق مہکتی ہے جس کی خوشبو سے
وہ باغِ عالمِ ہستی میں کونسا گُل ہے

○

دِل میں ہے طلب ، ہلکر تجھ سے ، اِتنا پوچھوں ، یہ تو بتا
پچھلے پہر کی سَرد ہَوا میں ، تُو نے مُجھ کو یاد کیا
اَب تک ہم دِیوانوں کی ، یہ راز سمجھ میں آ نہ سکا
پتّھر مارا ، شیش محل پر ، اپنا گھر کیوں ٹوٹ گیا
پھُولوں کی لگن میں یہ وحشی ، بیتاب ہُوا ہے زخموں سے
اِن کانٹوں کا شکوہ کوئی نہیں خود گھر سے برہنہ پا نکلا
درپیش مسائل پہ سوچو ، کچھ شاید اُن کا حل نکلے
"جو گزری سو گزران ہوئی" اَب یارو اُس کا چرچا کیا
کچھ دیر سویدا ، سوچ تو لو ، کس رنگ پہ مائل ہونا ہے
یہ خوشبُو باغ کے پھُولوں کی ، یہ بھبکا کورے پنڈے کا

لندن ، ۳۰ - جون ۱۹۸۵ء

○

فکر و نظر ہیں مہرِ جہاں تاب بن گیا
گزرا جو وقت آج وزیر الحسن کے ساتھ

یکم دسمبر ۱۹۷۲ء

جس قدر دیکھو اُبھرتے ہیں نقوش زندگی دیکھی تری تصویر میں

○

ایسے تپے کہ دھوپ سے دِیوانے مر گئے
اِس دشتِ یاس کو مگر آباد کر گئے

کل تک جو اپنے ساتھ تھے، احباب دِلنواز
ہم ڈھونڈتے ہیں اُن کو، نہ جانے کدھر گئے

ٹکرانا چاہتے تھے حوادث سے ہم مگر
آیا جو وقت، اپنے ہی سائے سے ڈر گئے

کچھ لوگ زندگانی پہ مَرتے رہے مدام
کچھ لوگ زندہ رہنے کو خود آپ مَر گئے

اِک دھن میں سوزِ غم کی گزرتی تھی زندگی
تم جو ہنسے تو اپنے یہ نغمے بکھر گئے

ماضی کی سمت جھانک کے دیکھو ذرا جمالؔ
ایسے نہ جانے کتنے ہی عالم گزر گئے

"بس[1] ایک ذات حضرتِ شیداؔ کی رہ گئی
دہلی سے رفتہ رفتہ سب اہلِ ہنر گئے"

لندن ۲۴ اگست ۱۹۸۵ء

[1] اپنے دادا اجملِ اعظمؒ کی اِسی زمین میں ایک غزل "دیوانِ شیداؔ" میں شامل ہے۔ اُس غزل کا ایک شعر اپنی غزل میں نقل کیا ہے۔

○

فرصت ملے ، دِکھائیں گے زخمِ جگر کو ہم
بھر دینگے رنگ و نُور سے تیری نظر کو ہم

آنکھوں میں تیرتا پھرا ٹپکا نہ اشکِ غم
دریا کوئی دِکھائیں گے اِس چشمِ تَر کو ہم

حرکت میں آئے ایک ہی ٹھوکر سے آپکی
منزل سمجھ چکے تھے جمودِ سفر کو ہم

رعنائیاں بھی گُم ہوئیں ، منظر بھی بُجھ گئے
بھُول آئے بزمِ یار میں اپنی نظر کو ہم

ہر شعر اِس غزل کا بہُت خُوب ہے ، مگر
کِس عیب میں شمار کریں اِس ہنر کو ہم

وحشت شناس ہوتی جو اپنی خودی جمالؔ
اِس بیخودی میں آگ لگاتے نہ گھر کو ہم

نیویارک ۳۰۔ اگست ۱۹۸۲ء

○

سماعت سُن نہیں سکتی مگر محسوس کرتا ہُوں
خموشی اور تنہائی میں اِک آواز آتی ہے

○

رات بھر ایسی چلیں پُروائیاں
زخمِ جاں کی بڑھ گئیں گہرائیاں

آپ کی زُلفوں کو بل دیتی رہیں
اِس دلِ بے تاب کی انگڑائیاں

تیرگی میں گُل کِھلائے گا جُنوں
آدمی بن جائیں گی پرچھائیاں

اِبتدا میں مختصر تھی زندگی
رفتہ رفتہ بڑھ گئیں پہنائیاں

کِس طرح دامن بچاؤ گے جمالؔ
عِشق کی تہذیب ھیں رُسوائیاں

لاہور، ۲۴-جنوری ۱۹۷۲ء

○

جو حقیقت کے گِرد گھُومتے ہیں رنگِ لُطفِ مجاز کیا جانیں
رہزنی کی بھی راہ ہوتی ہے ہم مسافر نواز کیا جانیں

○

تیز ایسی ہوتی ہے بینائی
بجھ گئی منظروں کی رعنائی

موجِ گُل ، برگِ گُل کے پردوں میں
جانے کس کس کی یاد لے آئی

دِل میں خواہش تھی چند قطروں کی
تشنگی ، میکدہ اُٹھا لائی

ماں کی انجان مامتا کی طرح
پھُول ٹوٹا تو شاخ تھرّائی

یہ بھی جلوے ہیں اُسکی قدرت کے
آنکھیں میری ، نہ میری بینائی

آپ کے شہرِ آرزو میں جمال
کوئی نغمہ ، نہ کوئی شہنائی

لندن ستمبر ۱۹۷۶ء

○

تیرے کوچے سے سوئے دشتِ وفا
ہم چلے ، شہرِ آرزو لے کر

○

کبھی ہے غم کی تمنا کبھی خوشی کی ہے
یہ زندگانی بھی پہلو بدلتی رہتی ہے

سبب بتائے کوئی میری پائمالی کا
زمانہ بدلا کہ اُس نے نگاہ بدلی ہے

جو سانس ہم نے لیا پُوری احتیاط کیساتھ
یہ جسم اپنا سہی جان تو پرائی ہے

کسی کے رُخ کی تجلّی سے وصل کی اُمید
ہزار رنگ کے شعلے سمیٹ لائی ہے

فروغِ فکر میں ڈوبی ہُوئی غزل کی مہک
دِل و دماغ سے اپنا خراج مانگتی ہے

غُبار اُٹھتا ہے دامن کو جھاڑنے سے جمال
بلا کی گَرد خدا جانے کِس سفر کی ہے

لاہور ۸۔ فروری ۱۹۸۲ء

○

دِل کے وِیرانے میں اِک گونج ہے سناٹوں کی　　کاش آ جائے کوئی حُسنِ سماعت لے کر
چند آنسُو دامنِ ہستی جلانے کے لیے　　چاندنی راتوں میں اِس دِل کی تپش سے مانگیے

○

شورِ خزاں میں دِل کا سکُوں پا رہے ہیں ہم
گُزری ہُوئی بہار کو یاد آ رہے ہیں ہم
زِنداں سمجھ کے نِکلے تھے، گھُٹتا تھا گھر میں دم
اب وُسعتِ حیات سے گھبرا رہے ہیں ہم
تنہائیوں کی گرد میں معدُوم تھا یہ جسم
شیشے کے سامنے تو نظر آ رہے ہیں ہم
رنگوں کے اِس ہجوم میں کجلا گئی نظر
خوش رنگیٔ بہار سے اُکتا رہے ہیں ہم
طُوفاں بنی ہُوئی ہے حیاتِ بشر جمالؔ
جینے کی آرزو میں مرے جا رہے ہیں ہم

لاہور ، جنوری ۱۹۷۵ء

○

نہ سہی وصل کوئی طرفہ تماشا ہی سہی — یعنی ہنگامۂ آشوبِ تمنّا ہی سہی
مُجھ میں یارا ہی نہیں، ترکِ تعلق کا جمالؔ — ٹُوٹ جانے کیلیے سانس کا رِشتہ ہی سہی

قطعہ

شیش محل سے آکر کوئی
چپکے سے کچھ کہہ جاتا ہے

سوچ میں پڑ جاتا ہے پاگل
ہاتھ میں پتھر رہ جاتا ہے

لاہور یکم جنوری ۱۹۸۵ء

○

مشکل جو تھا وہ عُقدہ خود ہم نے حل کیا تھا
وُہ دن گئے ، کہ اپنا ناخن گرہ کُشا تھا

صحرا کی سمت جاتے ، مجبُور ہو گئے ہم
حرص و ہوس نے بڑھ کر دامن پکڑ لیا تھا

اِس شب کی تیرگی میں آنکھوں نے کچھ نہ دیکھا
گزُرا ہے کوئی سایا اِحساس کچھ ہُوا تھا

اِعجازِ عشق ہم نے اِس رَہروی میں دیکھا
ٹھوکر لگی تھی ہم کو اور دُوسرا گِرا تھا

کچھ یاد ہے سُوَیدا ، وہ اجنبی مسافر
گزُرے تھے ہم کہاں سے کِس راہ میں مِلا تھا

لاہور، ۳۱ ر دسمبر ۱۹۸۹ء

○

جو رہبروں کی چال سے آگے نکل گئے
لغزش کے احتمال سے آگے نکل گئے

کچھ لوگ اپنے حال میں گم ہو کے رہ گئے
کچھ لوگ اپنے حال سے آگے نکل گئے

قوسِ قزح کا رنگ بہت تیز ہو گیا
یہ پھول اعتدال سے آگے نکل گئے

طولِ شبِ فراق کا یہ شعبدہ سہی
لمحے بڑھے تو سال سے آگے نکل گئے

منزل سے ہم کنار تھے اہلِ جنوں جمالؔ
کیا جانے کس خیال سے آگے نکل گئے

لاہور، ۲۰۔ستمبر ۱۹۷۲ء

○

میکدے کی روشنی کم ہو گئی کس قیامت کی گھٹا چھائی کہ بس
جب قدم شائستۂ منزل بنا چلتے چلتے یہ ندا آئی کہ بس

○

اِس زبوں کاریٔ افکار نے مارا مجھ کو
ہفت افلاک کی رفعت سے گرایا مجھ کو

جس طرح جیسے بہائے گا بہے جاؤں گا
موڑنا آتا نہیں وقت کا دھارا مجھ کو

رَہروِ راہِ محبّت کو نظر آتا ہوں،
نقشِ پا تھا تری شوخی نے ابھارا مجھ کو

ہفت افلاک کی پہنائیوں میں تیروں گا
تیرے دامن کا جو مل جائے سہارا مجھ کو

نغمگی گھل سی گئی ساری فضاؤں میں جمالؔ
اِس نئے رنگ سے یہ کس نے پکارا مجھ کو

لندن، ۷ جون بروز اتوار ۱۹۸۷ء

—○—

دشتِ غربت ہے اور احساس ہے تنہائی کا　　آپ آجائیں تو ہم آپ میں گم ہو جائیں

○

ہر قدم پر راہ میں سجدا کیا بار تھا سر پر اُسے ہلکا کیا

اِس زمیں پر جب اُتارا تھا ہمیں فکر کو کیوں آسماں پیما کیا

یُوں بظاہر مختصر ہے آدمی کتنی گہرائی میں ہے، سوچا کیا

عشق کا ہر راز اِس دِل میں رکھا میری صُورت نے تمھیں رُسوا کیا

مُدتوں کے بعد آئی تھی ہنسی عمر بھر اُس کا سبب سوچا کیا

رات کو فرصت میں یہ سوچو جمال

تُم نے اِس دُنیا میں آ کر کیا کیا

کتبہ

لندن بروز منگل ۳۰ اگست ۱۹۸۸ء

دیوار سے ٹیک لگا کر ہم ہیں بیٹھے ہوئے اِک مُدت سے یہ خوف ہے، ہم جب اٹھیں گے دیوار تری گر جائیگی

روزِ ازل سے اِس کو میسّر ثبات ہے نقشِ وفا کو عُمرِ گریزاں سے کیا غرض

○

سُرخ پھولوں کے گرد ہالے تھے
یہ حرارے ترے لبوں کے تھے

شعرِ موزوں مزاج تھا اپنا
ورنہ اُستاد ہم کہاں کے تھے

میری موجودگی میں ہر لب پر
میری گم گشتگی کے چرچے تھے

یہ فروغِ نظر کا دھوکا تھا
رنگ اُمّید کے جو چمکے تھے

غربتِ شہرِ آرزو کی قسم
گھر سے نکلے تو اجنبی سے تھے

آدمی کُوچ کر چُکے تھے جمال!
شہر میں صرف اُن کے سائے تھے

لاہور ، ۲- مارچ ۱۹۷۵ء

○

اب تک نہ ہوئی صَرفِ درِ یار سویدا
کچھ اور مُداوا مری شوریدہ سری کا

○

گُل ہنسیں ، ہنستے ہنستے مرجائیں باغِ ہستی میں رنگ بھر جائیں
ہم مسافر ہیں ، تیری دُنیا سے بے تعلق یونہی گزر جائیں
کوئی گلچیں نہ ہو تو یہ گُل بھی شاخ سے ٹُوٹ کر کدھر جائیں
زِندگی کی وبا سے گھبرا کر دِل کی گہرائی میں اُتر جائیں
فاصلے ناپتے ہیں دِیوانے دشت سمٹے تو اپنے گھر جائیں
کچھ تو مہکے فضائے عشق جمالؔ
پھُول بن کر کہیں بکھر جائیں

لاہور ۲۔مئی ۱۹۷۵ء

○

اپنا نہیں تو میرؔ کا قصہ سہی جمالؔ
اِس اجنبی سے دیس میں کچھ تو سنائیے

گر نہ ہو باغ میں دم بھر کو چمکنے کی ہوس
کیوں قفس برقِ حوادث کا سہارا چاہے

لندن ، ۲۸۔جولائی ۱۹۷۶ء

○

مری سوچ کو وہ سمجھ گیا جسے خود مٹا کے چلا گیا
مَیں سر جھکائے ہُوا تھا گُم سُم وہ سر اٹھا کے چلا گیا

مری حسرتوں کا مآل یہ مری آرزوں کا حشر یہ
رہا جس کا مدتوں منتظر وہ جھلک دکھا کے چلا گیا

اِنہی ظلمتوں کے غبار میں اِسی بیکسی کے دیار میں
اِک چمک سی آئی نظر مجھے کوئی جیسے آ کے چلا گیا

مرے دل میں حشر بپا رہا کہ نہ سو سکا مَیں تمام عمر
مَیں جو پہلے خوابِ گراں میں تھا وہ مجھے جگا کے چلا گیا

جو جھلک سی دیکھی تھی دُور سے وُہی کام اپنا دِکھا گئی
کوئی سحر تھا ترے حُسن میں مجھے بُت بنا کے چلا گیا

وہی سنگِ در وہی عاجزی مری زِندگی کا شعار ہے
مری بندگی کا غرور خود مرا سَر جُھکا کے چلا گیا

تجھے مِل گیا تھا اِک ہم سفر کہ جو صحرا صحرا گلی گلی
وہ سُوَیدا تیرے قدم جما کے تجھے چلا کے چلا گیا

لندن ٢٧ ستمبر بروز اتوار ١٩٨٨ء

○

آنکھوں میں کاجل، گالوں پہ سُرخی، سرخی بھی کیسی، ہلکی گلابی
عشوہ و غمزہ، ہم کو دِکھاتی، چال چلے ہے، جیسے شرابی

لہجے میں نغمہ، نغمے میں لہرا، لہرے میں مَستی، مستی میں لذّت
لذّت میں جذبہ، جذبے کی شدّت، وصل کی خواہش، وہ بھی شتابی

زورِ جوانی، طوفاں اُٹھائے، ہونٹوں کی لرزش، پاس بُلائے
یارِ سویدا، عِشق نہ کیجو، عشق میں اِس کے خانہ خرابی

○

کِن کِن احبابوں سے مجھ کو، رنگِ وفا کا عطر ملا
کِن کِن احبابوں کے ہاتھوں پامال ہُوا ہوں سوچنے دو

○

ریزۂ مینا چبھوتے ہو رگِ جاں میں جمالؔ
تشنگی کی آگ میں سیلابِ جاں دیکھا نہیں

جمالؔ جس کے نتیجے میں دُوریاں نِکلیں کِسی بھی شخص کے اِتنا کوئی قریب نہ ہو

منظر کو جو دِکھاتی ہے خوش رنگ و دلفریب ایسی بھی اِک نظر ہے ہماری نظر کے ساتھ

○

نکہتِ زُلف کا پیغام صَبا لائی ہے
مژدہ اے دشت نشینو! کہ بہار آئی ہے
تیشۂ فِکر سے منظر کو کُریدا تو کھلا
ہم تماشا ہیں کوئی اور تماشائی ہے
ہوک اُٹھتی ہے تو محسوس یہ ہوتا ہے ہمیں
سوز میں ساز کے پندار کی گہرائی ہے
سُرخ پھولوں سے مہک اُٹھتا ہے جو باغِ عدن
اِک مسیحا کے تبسّم کی مسیحائی ہے
وقت اِک ایسا بھی گزرا شبِ تنہائی میں
سانس لیتے ہُوئے یہ زندگی گھبرائی ہے
عہدِ ماضی پہ نظر ڈالی تھی اِک بار جمال
آرزو ، یادوں کے انبار اُٹھا لائی ہے

○

کِدھر سے آئے ، کدھر جاؤ گے جواب تو دو   غمِ حیات خریدو گے زادِ راہ کے لیے

○

صاحبِ دِل، صاحبِ اظہار بن جائے تو بات
رفتہ رفتہ ضبطِ غم گفتار بن جائے تو بات

دوستوں میں روز و شب تُو ڈھونڈتا پھرتا ہے کیا
ایک بھی اِس دَور میں غم خوار بن جائے تو بات

وہ منازل طے کریں گے جو نظر آتے ہیں دُور
زندگی خود "رخشِ خوش رفتار" بن جائے تو بات

ٹوٹ جائے خود بخود سارا طلسمِ خامشی
غنچۂ دل آپ ہی گفتار بن جائے تو بات

شوخ رنگوں سے بھرو صحرا کے دامن میں بہار
اَے مصوّر، اِس طرح شاہکار بن جائے تو بات

تپتے صحرا میں کہیں سایا نہیں مِلتا جمالؔ
دھوپ خود جم کر اگر دِیوار بن جائے تو بات

لندن ۲۹ جون بروز پیر ۱۹۸۷ء

کچھ صباحت ہے کچھ ملاحت ہے　　دِل کشی اُس کی اِک قیامت ہے

عید کے دِن گلے سے لگ جانا　　یہ محبّت کی اِک روایت ہے

میری نظریں جو نیچی رہتی ہیں　　یہ ترے حُسن کی عِبادت ہے

تیرے اِس شہر کی ہواؤں سے　　جاں کو آرام، دِل کو راحت ہے

اَپنے سِینے سے تُو لگائے رکھ　　داغِ دِل تمغۂ محبّت ہے

آپ اور ہم ہیں ساتھ یہاں　　یہ بھی کچھ وقت کی عنایت ہے

جانے کِس سنگ دِل سے ٹکرائے　　نبض میں آج کچھ صلابت ہے

عمر تیری دراز ہو اَپل　　کِس بلا کی تیری ذہانت ہے

ہَم سے مل کر تمھیں خوشی ہو گی　　شہرِ لندن میں کچھ فراغت ہے

اپنا انداز والہانہ سہی — اپنی ہر بات میں صداقت ہے

تلخ باتوں کو درگزر کرنا، — میرا کردار ہے شرافت ہے

روز ہوتی ہے سنگ باری مگر — سر مرا آج بھی سلامت ہے

میرے اشعار میں یہ لطفِ زباں — میری تہذیب کی علامت ہے

میری خاموشیوں کے پردے میں — عقل ہے، سوچ ہے، فراست ہے

کیوں پلاتے ہو مجھ کو زہرِ خرد — اس میں کیا نکتۂ حذاقت ہے

ذہنیت کے زوال کی شاید، — خود پرستی بھی اک علامت ہے

اِن خرد کاریوں کا یہ حاصل — کچھ دلائل ہیں کچھ درایت ہے

اِتنا شفاف ہو چکا ہے جمال — تیرا آئینہ میری صورت ہے

لندن ۳ر جولائی بروز جمعہ ۱۹۸۷ء

○

تیری محفل سے جو اُٹھ جائے وہ پھر کیا دیکھے
عُمر بھر اپنا ہی خود آپ تماشا دیکھے

گھر تو محدود ہے اِس وُسعتِ طوفاں کیلیے
چشمِ آشوبِ تمنّا کوئی دریا دیکھے

دیکھتے دیکھتے کجلا گئی بینائی بھی
اَب کہاں تک کوئی خوش رنگیٔ دنیا دیکھے

ہم نفس ساتھ اگر ہو تو نظر بھی بدلے
ایک منظر کو کہاں تک کوئی تنہا دیکھے

چلتے رہنے کی جو راہی کو تمنّا ہے جمالؔ
جس کی منزل نہ ہو ایسا کوئی رَستا دیکھے

لاہور، ۱۹۷۲ء

○

خود بخود زعمِ بلندی سے نکل آتا ہے سایہ دِیوار کی بنیاد میں ہوتا ہی نہیں

مُجھ کو احساس ہے رشتے کی نزاکت کا جمالؔ چلتی تلوار سے پیمانِ وفا کیا باندھوں

تابِ نظّارہ میں وہ جراَتِ بینا ہی نہیں
غور سے آپ کا چہرہ کبھی دیکھا ہی نہیں

آرزو لاکھ تشفّی کی نکالے صُورت
زخمِ دل ، سوزِ تمنّا کا مداویٰ ہی نہیں

اپنے بچپن کے کسی نغمے نے سُلایا تھا ہمیں
پھر ترے دَور کے سازوں نے جگایا ہی نہیں

کتنے کھنڈرات کے پَرتو ہیں مری آنکھوں میں
اپنے اِس حال کی بابت کبھی سوچا ہی نہیں

خود بخود زعمِ بلندی سے نکل آتا ہے
سایہ دیوار کی بنیاد میں ہوتا ہی نہیں

جس کو نہ اپنی خبر ہے نہ زمانے کی جمالؔ
ایسے بیمارِ محبّت کا مداویٰ ہی نہیں

لاہور ، دسمبر ۱۹۸۵ء

تجھے زیبائشِ رخسار کا ڈھنگ
فروغِ لالہ و گُل سے مِلا ہے

○

بات یُوسف کی چھڑی اور زلیخا خاموش
عشق کی اپنی روایات نے رکھا خاموش

کچھ نئے چہرے نظر آتے ہیں مَیخانے میں
گوش دارد، دَر و دِیوار، خُدارا خاموش

جِسم حرکت میں رہے، باتیں اشاروں میں ہُوئیں
ہر تماشائی ہے، بیزار تماشا، خاموش

بے سَبب لڑتے ہی رہتے ہیں، یہ دُنیا والے
مصلحت بینی یہی ہے کہ تُو ہو جا خاموش

جانے کِس سوچ میں ڈوبا ہوا رہتا ہے جمال
سر جُھکائے ہوئے دیکھا ہے ہمیشا خاموش

لندن ۲۱ جون بروز اتوار ۱۹۸۷ء

قوسِ قزح کو دیکھ کر آنکھیں جو بند کیں — اُس گلبدن کی ہُو بہُو تصویر بن گئی

مِری نگاہ میں طاقت نہیں ہے جب اتنی — مَیں اپنی فکر کی پرواز کس طرح دیکھوں

○

ہزار کلیاں چٹک چٹک کر کھِلیں تو گلشن میں پھول مہکیں
مہک کے شعلے بھڑک اُٹھیں تو شجر شجر پر طیور چہکیں

یہ جسم لپٹا ہو نکہتوں میں فضا سے عیش و نشاط برسے
گلوں پہ ایسا نکھار آئے کہ رنگ بن کر چمن میں دہکیں

چلیں کبھی ہم جو سُوئے گلشن اُٹھائیں لُطفِ بہارِ گلشن
سرور اتنا فروغ پائے کہ بے پیے سارے یار بہکیں

کچھ ایسا منظر بنے سویدا کہ لُطف آ جائے زندگی کا
قدم قدم پر صبا کے جھونکے نظر نظر سبزہ زار لہکیں

لاہور ۳۰۔ اپریل ۱۹۸۴ء

○

ڈھونڈتا پھرتا ہے ہر جنسِ گراں غربت میں — یہ مُسافر ابھی بازارِ تمنا دیکھے

بکھرے ہوئے جو رنگ تھے موجِ بہار میں — آپس میں جب ملے تری تصویر بن گئی
حلقے سے حلقہ فکر کا ایسا جڑا جمالؔ — جوشِ جنوں کے واسطے زنجیر بن گئی

○

اس شیش محل میں کوئی موجُود نہیں ہے
حیرت ہے مکیں، جلوہ مقصُود نہیں ہے
یُوں پھرتے ہیں اِس سر کو لیے کُوچہ بکُوچہ
جیسے یہاں اپنا کوئی معبُود نہیں ہے
ہر آبلہ پائی کی روایات کا ضامن
کانٹا کوئی اِس دشت کا بے سُود نہیں ہے
آواز کے ہر رنگ کی تصویر فضا میں
دیکھے سے نظر آئے گی نابُود نہیں ہے
اِس دام گہہِ عِشق کے حلقوں میں سویدا!
موجُود وہی ہے کہ جو موجُود نہیں ہے

راولپنڈی، ۲۰۔ دسمبر ۱۹۷۳ء

○

سرائے عالمِ ہستی ازل سے قایم ہے
بدلتی رہتی ہے صُورت یہاں مُسافِر کی

○

پچھلی باتیں نئے زمانے میں — دیر لگتی ہے یاد آنے میں

آپ زیبائشِ رخسار میں گم — ہم رہے اپنے ہی اشعار میں گم

وقت ناساز ہے انساں معذور — ہر انا گوشۂ پندار میں گم

رات بھر پلکیں جھپکتی ہی نہیں — خواب ہے دیدۂ بیدار میں گم

ساقی کچھ یاد بھی ہے تجھ کو حساب — کتنے خُم ہو گئے میخوار میں گم

یعنی منزل کا تصوّر ہی گیا — راہرَو اپنی ہی رفتار میں گم

"نغمۂ کُن" سے تجلّی پھوٹی — ہے فضا موجۂ انوار میں گم

جانے کس سمت ہے وہ اپنا غزال — برقِ رعنائی ہے کہسار میں گم

رُخ بدلتے ہو گفتگو کا جمال — رہتے ہو گیسوئے شبیار میں گم

لندن یکم جون ۱۹۸۷ء

○

کتنے دریا بھرے ہیں، آنکھوں میں ۔۔۔ کتنے شعلے بجھے ہیں، آنکھوں میں
آنے والے کی منتظر ہے نگاہ ۔۔۔ کتنے در کھُل چکے ہیں، آنکھوں میں
کِس قدر یہ پپوٹے بھاری ہیں ۔۔۔ کِس قدر رتجگے ہیں، آنکھوں میں
کِتنی حسّاس یہ طبیعت ہے ۔۔۔ پھُول چبھتے رہے ہیں، آنکھوں میں
دن کو شورش ہے اور ہنگامے ۔۔۔ رات ہم کاٹتے ہیں، آنکھوں میں
کِس طرح کھولیں اپنی آنکھیں ہم ۔۔۔ آپ آئے ہُوئے ہیں، آنکھوں میں
تپتے صحرا میں پھرتے رہنے سے ۔۔۔ آبلے پڑ گئے ہیں، آنکھوں میں
کوئی تصویر بن رہی ہے جمالؔ ۔۔۔ رنگ بکھرے ہوئے ہیں، آنکھوں میں

لندن، ۲۰ر جون بروز ہفتہ ۱۹۸۷ء

غم کا مارا اِک خبطی سا تیشہ اپنے ہاتھ میں لے کر ۔۔۔ شہر کا رستہ جانبِ صحرا جانے کب سے موڑ رہا ہے

ہوائیں تیز ہُوئیں جب سے اس گلستاں کی ۔۔۔ شعور جاتا رہا آشیاں بنانے کا

دِیوانے

آج میرے وطن کی سڑکوں پر
گھومتے پھر رہے ہیں دِیوانے

کِس کا سَر آگیا ہے اِن کو نظر
کِس طرف رُخ کریں خُدا جانے

لندن ۲۴- اگست ۱۹۸۵ء

○

خودسری خود نما بشر میں رہی
یہ خرابی ہر ایک سر میں رہی
کس قدر تنگ تھی قفس کی فضا
پھر بھی جنبش سی بال و پر میں رہی
عزمِ رہرو کی نارسائی سے
منزلِ ہر سفر، سفر میں رہی
لے گئی برگ و بار بادِ خزاں
شوکتِ سایہ ہر شجر میں رہی
لغزشِ دل پہ اختیار نہ تھا
لغزشِ پا مری نظر میں رہی
ماندگی سے مسافروں کی جمال
ایک حسرت سی رہگذر میں رہی

لندن ، ۹- جون ۱۹۷۶ء

○

فریبِ شاہد و مشہود سے گزر ناداں!
حیاتِ عشق تو حُسنِ تصوّرات سے ہے

○

رتبہ ایسا بڑھا ترے در کا
کوئی سجدہ نہ تھا برابر کا

جس کو ہم اپنا گھر سمجھتے تھے
قصر نکلا کسی تونگر کا

تیرا انداز تھا نیا ہر آن
مَیں تمنّائی ایک منظر کا

لاکھ بدلو زحل کی تاثیریں
لکھّا مٹتا نہیں مقدّر کا

یاد آتے ہو اِس لیے اشعرؔ[1]
ساتھ چھُوٹا ہے زندگی بھر کا

میرے دِل سے بھی مَوج اُٹھتی ہے
میں بھی قطرہ ہوں اُس سمندر کا

عزّتِ نفس جَل نہ جائے جمالؔ،
کم نہیں شعلہ کثرتِ زر کا

لاہور، ۲۱ مئی ۱۹۷۳ء

○

[1] حکیم حبیب اشعرؔ مرحوم

○

اے دلِ زار! دو گھڑی سو جا!
رات آدھی گزر چکی سو جا!

لوریاں دے رہی ہے سرد ہوا
نیند آنکھوں میں بھر گئی سو جا!

کوئی دم ساز تیرے پاس نہیں
آپ ہی جاگ آپ ہی سو جا!

موت کو اک طرح کی نیند سمجھ!
سونے والے! ہنسی خوشی سو جا!

جاگنا زہر بن چکا ہے جمالؔ
عمر شاید گزر چکی سو جا!

لاہور، یکم نومبر ۱۹۷۲ء

○

غربتِ عشق کا مارا ہُوا راہی ہے جمالؔ
اس کو ہر شہر کے بازار میں تنہا سمجھو

○

موڑ ہی موڑ رہ گئے ہیں جمالؔ راہ کوئی بھی مستقیم نہیں

○

تیرا تو گھر نہ تھا مرے گھر سے بِلا ہُوا
پھر کِس طرح یہ عشق جنوں آشنا ہُوا

رہ جائے آج دستِ مسیحا کی آبرو
نکلے گا جاں کے ساتھ یہ نشتر چُبھا ہُوا

لَو دے اُٹھے گا اِسکو نسیمِ سحر نہ چھیڑ!
یہ داغِ دل ہے صحبتِ شب کا جلا ہُوا

طُوفانِ گرد باد تھا، جو دشتِ یاس تک
کھائی ہوا چمن کی تو بادِ صبا ہُوا

گردن جھکائے ہاتھ میں تیشہ لیے ہُوئے
گزرا ہُوں کوہسار سے کُچھ سوچتا ہُوا

مُرجھا کے رہ گئے اِسی اُمید میں یہ پھُول
لَوٹ آئے گا بہار کا موسم گیا ہُوا

دُنیائے بے ثبات میں یہ سانس بھی جمالؔ
آیا تو کیا ہُوا، جو نہ آیا تو کیا ہُوا

لاہور ۱۳ دسمبر ۱۹۷۸ء

○

○

داغِ دِل ، دِل کی اُمیدوں کا سہارا کیوں تھا
سوزِ غم ، سازِ تمنّا کو گوارا کیوں تھا
تشنگی میرے مقدر میں اگر لکھی تھی
پھر مے و جام سے میخانہ سنوارا کیوں تھا
بیچ منجدھار میں جب ڈوب رہی تھی کشتی
اِن اُمیدوں کو کنارے کا سہارا کیوں تھا
عرش تک کس طرح پہنچے گی صدا اِنساں کی
پھر تجھے خاک نشینوں نے پکارا کیوں تھا
تیرگی کی کسی کروٹ کا کرشمہ تو نہیں
صُبحِ اُمید کے پہلو میں ستارا کیوں تھا
زندگی دشت میں جب اپنی گزرنی تھی جمال
سبزہ زاروں سے تصوّر نے گزارا کیوں تھا

لندن ۱۰ جون ۱۹۷۸ء

○

چلتے ہُوئے منظر کی زمیں ناپ رہا ہے
راہی ہے سویدا بھی جہانِ گزراں کا

○

سُرخرو ہو کے یہ آنسو جو ہمارے نکلے
دِل کی پامال تمنّا کے سہارے نکلے
شوق تھا پھُولوں سے دامن کو بھرے گا وحشی
جب بہار آئی تو ہر گل سے شرارے نکلے
اِس طرح گزرا بیاباں سے مرا پائے طلب
نوکِ ہر خار سے گلرنگ نظارے نکلے
تیرگی چاٹ چُکی جب مری بینائی کو
گوشۂ چشمِ تمنّا سے ستارے نکلے
سر نکالا نہ کبھی گھر کے دریچے سے جمالؔ
ہم اگر نکلے غمِ دِل کے سہارے نکلے

لاہور ۔ مارچ ۱۹۷۳ء

○

مجھے بھی اپنی حقیقت کا کچھ سُراغ ملے
گرو جو مجھ پہ کبھی برقِ آگہی کی طرح

○

تشنہ کاموں کی تشنگی سے جمالؔ میکدے کا مزاج قایم ہے

○

پھرتے ہیں بارِ غم اُٹھائے ہم
ایسی ہمّت سے باز آئے ہم
زخم دل کا کوئی کرشمہ تھا
مدّتوں بعد مُسکرائے ہم
زندگی کی حلاوتوں کے لیے
غم کی دنیا سمیٹ لائے ہم
ہچکیوں میں عجب تسلسل تھا
جانے کِس کِس کو یاد آئے ہم
وُسعتِ دشت و در سِمٹ آئی
ایک ذرّے میں جب سمائے ہم
اِن بہاروں پہ اعتبار نہ تھا
خُشک پتّے بھی ساتھ لائے ہم
ماہ و انجم کی رفعتوں سے جمالؔ
بارہا گُزرے سر جُھکائے ہم

لندن ۳۱- جولائی سنہ ۱۹۷۶ء

○

ظُلمت میں ضیاء ڈھونڈتے پھرتے ہو کِس لیے
بکھرے تھے اُسکے رُخ سے جو انوار کیا کِیے

جو لوگ اُس کی بزم سے گھبرا کے اُٹھ گئے
یہ دیکھنا پڑے گا کہ پھر کتنے دِن جیے

ایسا ہنسے کہ طنز کا پہلُو عیاں ہُوا
مانگے تھے پھُول آپ نے کانٹے چبھو دِیے

ہنسنے سے جس کے بکھرے گا شیرازۂ بہار
اُس گُل پہ جان دیتے ہیں ہم لوگ کِس لِیے

یہ بھی کوئی کرشمۂ چشمِ جمال تھا
کچھ مست ہو کے نِکلے ترے گھر سے بے پیے

کراچی ۲۰۔ مارچ ۱۹۸۱ء

○

یہ قیدِ مسلسل مجھے تا حشر ہے منظور
اِس روزنِ زنداں میں کوئی شکل بنا دے

بدلے ہوئے ماحول سے ڈرتا ہے سویدا
یہ دَور کہیں آنکھ کا پردا نہ اُٹھا دے

○

پھول جیسا یہ سراپا یار کا مجموعہ جیسے مرے اشعار کا
اُسکی رگ رگ میں مسیحائی کا زعم پوچھنا کیا آپ کے بیمار کا
جس کے دم سے زندگی رقصاں ہوئی ساقیا! یہ میکدہ میخوار کا
اے مسیحائے دلِ آزردگاں کچھ مداوا اِس دلِ بیمار کا
زندگی سمجھے ہو تم جس کو جمالؔ
خواب ہے اِک دیدۂ بیدار کا

لندن ۲۱ - اکتوبر سنہ ۱۹۸۴ء

○

جس میں گویائی ہے ایسا رنگ ہوں
نغمۂ فطرت سے ہم آہنگ ہوں

مختصر سی ایک دُنیا ہو جمالؔ
وُسعتِ فکر و نظر سے تنگ ہوں

○

اِس رَبط کا اَے باغباں مِلتا نہیں سُراغ
توڑا تھا ایک پھُول اور مُرجھا گیا ہے باغ
فِکر و عمل کی راہ نِکالے گا کِس طرح
ٹوٹے ہُوئے خمار کا اِک مضمحِل دماغ
سچ پوچھیے تو کھا گئی یہ تنگیٔ قفس
دم گھُٹ کے رہ گیا کہ میسّر نہ تھا فراغ
اِس شہر کی فضا کو خدا جانے کیا ہُوا
بڑھتی رہی ہے تیرگی جلتے رہے چراغ
کچھ لوگ ڈوب کر بھی اُبھر آئے تھے جمالؔ
کچھ لوگ ایسے گُم ہوئے مِلتا نہیں سراغ

لاہور ، ۸ فروری ۱۹۸۱ء

○

یُوں شاخِ گل جُھکی کہ زمیں بھی لرز اُٹھی
یُوں آندھیاں چلیں کہ چمن دشت ہوگیا

○

خشک پتّوں میں کوئی جھونکا ہوا کا ہو گا
یا مجھے میری تمنّا نے پکارا ہو گا

عالمِ یاس میں اکثر یہ خیال آتا ہے
اِس دلِ زار نے ہنسنا بھی تو سیکھا ہو گا

اور ڈوبے گا سفینہ تو اُبھر آئے گا
اور چھائے گا اندھیرا تو اُجالا ہو گا

کہکشاں ورطۂ حیرت میں سمٹ آئی ہے
کوئی آئینہ قدِ یار سے گزرا ہو گا

دشت اِک نُقطۂ پرکار نظر آتا ہے
عقل نے فکرِ جنوں کار کو ناپا ہو گا

اے سویدا! تجھے اِس تلخیٔ ایام کے ساتھ
زندہ رہنے کے لیے زہر بھی پینا ہو گا

لاہور ، ۱۷- اپریل ۱۹۷۲ء

○

جذبے میں وہ فروغ نہ وہ ولولے جمال
ہم خود ہی احتیاط کی منزل میں آ گئے

خُدا جانے وہ کون تھی

جمالؔ ! چاند سے گورا تھا کامنی کا بدن
رگوں میں تیرتی پھرتی تھی روشنی کی کرن
اور اُسکی آنکھوں میں روشن تھے زندگی کے چراغ
اور اُسکے چہرے پہ بکھرا ہُوا تھا "باغِ عدن"
ہزار پھولوں کی نکہت تھی اُسکی زُلفوں میں
ہزار غُنچوں سے مِل کر بنا تھا اُس کا بدن
سرورِ کیفِ نظر ساز، چشمِ آہو صفت
نشاطِ حسنِ تقدس نواز، رُخ کی پھبن

لندن، ۱۵- جولائی ۱۹۸۶ء

○

در دریچے میں علائق کی سلاخیں ہیں جمالؔ راستہ کوئی نہیں گھر سے نکلنے کیلیے

کِس کِس کے دُکھ کاٹ رہا ہے اک دِیوانہ شہرِ وفا کا

اور بھی چہرے ملیں گے مرے مجموعے میں
فردِ واحد کا تصور کئی افراد سے ہے

○

سُرخ پھُولوں کی دمک آپ کے رُخساروں میں
دِل کو آرام ملے گا اِنہی انگاروں میں

ایسے ہی قصرِ بلندی نہیں پایا کرتے
ہم سے دِیوانے بھی مدفُون ہیں آثاروں میں

ڈھونڈ سکتا ہے ہمیں صِرف کوئی اہلِ نظر
ہم پڑے رہتے ہیں اشعار کے انباروں میں

بھُولے بھٹکے کبھی یہ دیکھنے آجاتے ہیں
کِس قدر ظرف ہے اِس دَور کے میخواروں میں

راستہ ڈھونڈ رہا ہوگا نِکلنے کے لیے
زلزلہ بند ہے اِن قصر کی دِیواروں میں

یہ زمانے کی ترقی کا کرشمہ ہے جمال
آبرو گھر کی ملے گی، ہمیں بازاروں میں

لندن ۵۔ ستمبر ۱۹۸۵ء

○

ہماری ذات ہی آسیبِ زندگی تھی جمال — ہم اپنی ذات سے ڈر کر کنارا کیا کرتے

○

دِکھائی جس نے ہر پہلو سے اِک صورت تباہی کی
اُسی بیدادگر سے ہے توقع داد خواہی کی

عجب انداز کا اِس دَور میں دستور ہے رائج
سزا پاتا ہے اِنساں آج اپنی بے گناہی کی

"اَنا الحق" کہہ تو سکتا ہے یہ سَر تن سے جُدا ہوکر
شہنشہ کو ضرورت کیا پڑی میری گواہی کی

کِسی بسمل کو تیری ذات سے شکوہ نہیں پھر بھی
تیری آنکھوں پہ تہمت رہ نہ جائے کم نگاہی کی

خراجِ عزم لینا چاہتی ہے اہلِ منزل سے
دِکھاتی پھر رہی ہے ماندگی تصویر راہی کی

پڑے اُس رُخ کا سایہ جو سویدا شب کی ظلمت پر
چمک اُٹھے گی اپنے آپ ہی قسمت سیاہی کی

کراچی ۱۵۔ جنوری ۱۹۷۷ء

○

کارواں پہ چھا رہا ہے قربِ منزل کا سماں
ہر مسافر ماہ و انجم راستے ہیں کہکشاں

○

ثباتِ جسم و جاں پایا تو ہوتا
کہ ہونے کا یقیں آیا تو ہوتا
سمجھ اپنے دلِ ناداں میں کیا تھی
سمجھ داروں نے سمجھایا تو ہوتا
گھڑی بھر کے لیے ہم سانس لیتے
کسی دیوار کا سایا تو ہوتا
تمہاری سُرمگیں آنکھوں کا جادو
گھٹا بن کر کہیں چھایا تو ہوتا
اُمیدِ وصل کی خاطر سویدا!
فریب آرزُو کھایا تو ہوتا

لاہور ، ۲۲۔ مئی ۱۹۷۳ء

○

جو حُسنِ کائنات سے نکلے نہ عمر بھر وہ اور کوئی شَے ہے ہماری نظر نہیں

○

نجد کا صحرا ہو، یا وہ غیرتِ محمِل جمال
مُجھ میں ہَے، جو کچُھ بھی ہے اور مجھ سے باہر کچھ نہیں

شعورِ خام

گدازِ عشق میں ناپختگی کا عالم تھا　　جمالؔ وہ بھی زمانہ گزر گیا اپنا
شعورِ دین سے لادینیت اُبھرتی تھی　　خدا گواہ ہے کہ دامن بچانا مشکل تھا

لندن، یکم اگست بروز ہفتہ ۱۹۸۷ء

خاموشی

میری خاموشیوں کے مرقد پر　　شاخِ گل خود بخود چٹختی ہے
میرے اس نطقِ نارسیدہ پر　　میری گویائی سر پٹختی ہے

لندن، ۱۸ر ستمبر بروز جمعہ ۱۹۸۷ء

○

کہاں اہلِ جنوں اِس دشت کی حد سے نکلتے ہیں
لپٹتی ہے زمیں رستے قدم کے ساتھ چلتے ہیں

کہانی خود بخود کوئی نیا پہلو بدل لے گی
مری رودادِ غم سے آپ کیوں پہلو بدلتے ہیں

پلٹ جاتے ہیں طوفاں ان کی اِک موجِ تنفّس سے
جو زہریلی ہواؤں کے بھپارے کھا کے پلتے ہیں

کوئی چپکے سے اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہے سینے پر
مچلتے ہیں جو ارماں اِس طرح شاید بہلتے ہیں

کسی نسبت سے اپنا سر جھکانے کی تمنّا ہے
اُٹھا کر تیرے دَر سے ہم جبیں پر خاک ملتے ہیں

فضا بجھنے نہیں دیتے کبھی بزمِ تمنّا کی
پسِ پردہ سویدا کچھ دیے ایسے بھی جلتے ہیں

لاہور ۲۹- فروری ۱۹۷٦ء

○

جھرمٹ میں سبز پتوں کے قائم تھی آبرو   اس پیرہن سے پھول نکل کر بکھر گیا

○

کہنے کو خُوب دُھومیں مچاتی رہی بہار
شاخوں کے سائے میں رہا وِیرانہ برقرار

سچ پوچھیے تو حِرص و ہَوا کا طلسم ہے
تم ہی وفا شناس، نہ ہم ہی وفا شعار

اپنی نظر کے وَصف سے ہم بیخبر رہے
اور دِل کی تابشوں کو سمجھتے رہے غبار

کیسے دِکھائیں دیدۂ عبرت طلب تجھے
زیرِ قبا توھم بھی ہیں ٹوٹا ہُوا مزار

بڑھتا ہے تشنگی کا سہارا لیے جمالؔ
میخانۂ حیات میں میخوار کا وقار

لندن، یکم نومبر ۱۹۷۴ء

○

یونہی ہنستے ہوئے آگے سے گزر جانے میں تیرے وحشی کی ذرا بات بنی رہتی ہے
جب کبھی محفلِ احباب سجاتا ہے جمالؔ ایک خوشبُو کی بہر حال کمی رہتی ہے

○

کلیاں چٹکیں، تو صدا بن کے رہی — یہ صدا، بانگ دَرا بن کے رہی
لاکھ دامن کو بچایا پھر بھی — زندگی، حرص و ہوا بن کے رہی
جس کو ہم تیرگی سمجھے تھے وہی — دِل میں خوش رنگ ضیا بن کے رہی
خواہشِ وصل کی یہ رعنائی — اُن کی آنکھوں میں حیا بن کے رہی
زندگی آخری مراحل میں — یادِ ایامِ وفا بن کے رہی

بیخودی پھر بھی غنیمت تھی جمال
آگہی دامِ بلا بن کے رہی

لندن ۱۴۔ اگست ۱۹۸۵ء

○

ہر تماشہ ہماری دنیا کا
اختلافِ مزاج سے نکلا

○

تیرا جلوہ مُحیطِ عالم ہے
میری آنکھوں میں روشنی کم ہے
آیئے! گُلِستاں کی سَیر کریں
آپ ہی جیسا شوخ موسم ہے
لاکھ آنکھوں نے ترجمانی کی
صُورتِ حال پھر بھی مُبہم ہے
فکر کے آخری مراحل میں
واھمہ بھی یقینِ محکم ہے
وحشتِ دل کا یہ فروغ جمال
کس پری وش کی زُلف برہم ہے

لاہور ۱۲- اپریل ۱۹۰۲ء

○

روشنی کثرتِ انوارِ محبّت کی چمک ورنہ اِن آنکھوں کی بینائی میں رکھا کیا ہے

○

چلتے رہنا جب مُسافر کا مقدر ہے جمال
منزلِ مقصُود سے آگے یہ رستے کیوں نہیں؟

○

اِس چمکتے ہُوئے انداز پہ ہر عقل ہے دنگ
کِس مصوّر نے بھرے ہیں تری تصویر میں رنگ

سنگِ لرزاں سے جو ٹکرائے تو محسوس ہُوا
اُس کے سینے میں نہاں ہے کسی تیشے کی ترنگ

پہلے جذبات کے شعلوں سے گزرنا سیکھے
پھر تری شوخیٔ رخسار سے لپٹے کی اُمنگ

خوش مزاجی سے نمو پاتی ہے ہر شاخِ حیات
مُسکرانے سے نکھر آتا ہے ہر پھُول کا رنگ

اِک کرشمہ ہے یہ سُورج کی شعاعوں کا جمال
ورنہ جس ذات کا شیشہ ہے اُسی ذات کا سنگ

لاہور ۲۷۔ اپریل ۱۹۷۴ء

○

اُن سے ملنے کی دلِ زار کوئی آس نہ رکھ
جذبۂ عشق بھی شائستۂ احساس نہ رکھ

مَیں تو دیوانہ ہُوں شعلوں سے لپٹ جاؤں گا
اپنے جذبات کی تصویر میرے پاس نہ رکھ

○

اِس نگریا میں یہ کون آیا   کِس نے بدلا رنگ ہوا کا
تیرا رُوپ ہَے ہر جیون میں   تجھ سے سُندر کون سی کایا
اِس نگری کی ریت نرالی   پُن دُوجے کا پاپ ہمارا
کون کِسی کا جیون ساتھی   ہر رشتہ ہَے جیتے جی کا
سُوکھی بستی چھوڑ کے بادل   دُور کہیں دریا پر برسا
دِل کے روشن ویرانوں سے
تیرا گھر آباد سویدا

لاہور ۲۵ ستمبر ۱۹۷۵ء

○

گُل تو موجُود ہیں فضا گم ہے
جو مِلا ، اِس سے کچھ سوا گم ہے
کون سُنتا ہَے ہم غریبوں کی
بے نوائی میں ہر نوا گم ہے

○

اِس حال میں لبوں پہ جو ہلکی ہنسی بھی ہے
دِل کی لگی کے ساتھ ذرا دِل لگی بھی ہے

خوش رنگیٔ بہار میں کیوں پھنس کے رہ گئی
یہ آرزو فریبِ نظر سے ملی بھی ہے

دشتِ وفا میں دھوپ کی شدّت کے باوجود
غربت سے تمتمائی ہوئی زندگی بھی ہے

کچھ دوستوں نے آپ ہی تبدیل کی روش
کچھ شیوۂ تپاک میں اپنے کمی بھی ہے

کو جھکائے رہنے سے محسوس یہ ہُوا
اِس بارِ غم میں، غم بھی ہے، خود آگہی بھی ہے

نظریں جما کے غور سے دیکھو ذرا جمالؔ
اِس میکدے کے سائے میں کچھ روشنی بھی ہے

ہوٹل فلیشمنٹ راولپنڈی، ۲۰ اپریل ۱۹۸۲ء

○

اپنی ہی عقل کی جودت نے اُبھارا تھا ہمیں
اپنی ہی فکر کی گہرائی میں ہم ڈوب گئے

فردیات

توجہاں ہے وہیں ہوگا ترا دیوانہ بھی پھول کے سائے سے ہٹتا نہیں ویرانہ کبھی

—○—

تم پوچھتے ہو کیسی گزاری جمالؔ نے ہم ڈھونڈتے ہیں عمرِ گریزاں کدھر گئی

—○—

یوسف تھا اضطرابِ زلیخا سے بے خبر دامن کا چاک اُس کے گریباں سے دُور تھا

—○—

کچھ عزمِ رہروی کے سہارے کی بات تھی کچھ بیخودی کی لاگ سے چلتا ہے کارواں

—○—

اس دورِ نارسیدہ کے بازار میں جمالؔ اہلِ ہنر بھی اپنا ہنر ڈھونڈتے پھرے

—○—

ہوتا کچھ ہے، ہم دیوانے دیکھتے کچھ ہیں گلشن میں شاخِ گُل کو اکثر تیرا ہاتھ سمجھ کے چُوما ہے

—○—

دھجیاں اُڑگئیں جب سارے گریبانوں کی پھر اک مجلس ہوئی آراستہ دیوانوں کی

—○—

صرف گرداب ملیں گے ناداں بحر میں راستے تو ہوتے نہیں

—○—

عشرتوں کے ہجوم سے ڈر کر میکدوں کی حدوں سے غُل نکلا

یُوں اُٹھایا پاؤں ہم نے جوشِ وحشت میں جمالؔ   وادیٔ غربت کا سارا فاصلہ جاتار

○

ایک منظر پہ ٹھہرتی ہے صبح و شام کہاں   دیکھیے جا کے رُکے گردشِ ایام کہاں

○

لپٹ جا ماندگی راہِ طلب سے   کہ اِس کا طُول منزل آشنا ہے

○

گُل تو عبرت گہِ گلزارِ تمنّا ہے جمالؔ   اور کچھ دیر ہنسے گا تو بکھر جائے گا

○

اِس دشتِ یاس کی تو فضا ایک ہے جمالؔ   نیرنگیاں دِکھاتا ہے اعجازِ چشمِ شوق

○

لمحہ بھر کے واسطے دُوری بھی ہو جاتی ہے گُم   جب تصوّر میں بہت نزدیک آ جاتے ہو تم

○

اپنی بینائی سے منظر کو کُریدا تو کھلا   ہم تماشا ہیں کوئی اور تماشائی ہے

○

جب خیابانِ تمنّا سے گزرتی ہے اُمید   مجھ کو شدّاد کی جنّت کا خیال آتا ہے

○

زورِ عہدِ شباب میں اکثر ہلکا ہلکا بخار رہتا ہے

—○—

نہ گفتگو میں حلاوت، نہ شاعری میں گداز جمالؔ تیرا عجب حال ہے وصال کے بعد

—○—

جانے کس شومیٔ قسمت کا تمنائی تھا عزمِ منزل لیے جو آپ کے در سے گزرا

—○—

نہ سہی وصل کوئی طرفہ تماشا ہی سہی یعنی اِک محشرِ آشوبِ تمنّا ہی سہی

—○—

اُسکی آنکھوں کی ضیاء شمس و قمر کی صُورت اُسکی زلفوں کی مہک نورِ سحر کی صُورت

—○—

کہاں کہاں سے قضا توڑتی پھرے گی جمالؔ ہزار رِشتے ہیں، اِس رِشتۂ حیات کے ساتھ

—○—

جو میرے ساتھ قدم سے قدم مِلا کے چلے جمالؔ ایسا کوئی ہم سفر نہیں مِلتا

—○—

اِسی اُمید میں صدیاں گزر چکی ہیں جمالؔ ذراسی دیر میں اُبھریں گے ڈوبنے والے

—○—

اپنی سمجھ میں آ نہ سکا یہ فسُونِ عشق جب آگ لگ رہی ہے تو ہم جلتے کیوں نہیں

میخانے میں جز جرص و ہوا کچھ بھی نہیں ہے ٹوٹے ہُوئے ساغر کے سِوا کچھ بھی نہیں ہے

کچھ بھی نہ اپنی چل سکی بزمِ حیات میں جو کچھ بھی ہم نے سوچا تھا، ویسا ہُوا نہیں

تیرے بغیر زندگی بیمار بن گئی پچھلے پہر کی چاندنی تلوار بن گئی

گھبرا گئے ہیں اپنے ہی طغیانِ جاں سے ہم اِسکا علاج ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم

تُو مسیحائے دلِ آزردگاں مَیں شکستہ دِل، شکستہ آرزُو

سرسراتی ہوئی پھُولوں سے صبا گزری تھی ہم یہ سمجھے درِ میخانہ کہیں باز ہُوا

کس کے افکار معطّر کرے یہ موجِ نسیم اَب کسے لا کے سنگھائے گُلِ تر کی خوشبُو

وَحدت میں کثرت کی رو سپنا اِک تعبیریں سَو

جس طرح موسمِ بہار آیا رُوٹھ کر جانے والے تُو بھی آ

فطرتِ گل سے آشنا نہ ہوئے ——— رہ گئے گُل سے رنگ و بُو لیکر

○

زندگی کوش نہ بن ! عاقبت اندیش ہے تُو ——— اِس طرح سامنے آ ! سب کہیں دُرویش ہے تُو

○

ساقیا ! ڈال آتشِ سیّال ——— جام بھرتا نہیں حوادث سے

○

صبحِ امّید کہیں وہمِ تمنّا تو نہیں ——— یہ اُجالا ، مِری ظلمت کا تماشا تو نہیں

○

ڈرتا ہُوں دیکھتے ہُوئے سُوئے اُفقِ جمال ——— ظلمت کا اِک فریب نمودِ سحر نہ ہو

○

دِل تو دِیوانہ ہے ، افسانے گھڑا کرتا ہے ——— آپکی زُلف میں حلقوں کے سِوا کچھ بھی نہیں

○

دِل کی لگی ، کچھ ایسی لگی ، کھا گئی مجھے ——— رونے کا تھا مقام ، ہنسی آ گئی مجھے

○

تیری اِن آنکھوں میں آشوبِ تمنائے جمال ——— شیشۂ دل میں ، پری خانے کی تصویر سہی

○

خشک صحرا میں ہوائے تند ہے تشنہ مزاج ——— تا بداماں کس طرح پہنچے گا یہ اشکِ زبوں

حُسن خود اپنی ذات میں گم ہے عِشق اُس کی صفات میں گم ہے

چلتا رہا ہے ہر کس و ناکس کی بزم میں اِس جامِ بدنہاد کی مٹی خراب ہے

یادوں کے اِس شیش محل کا ہر شیشہ ہے، صُورت گر

سو بجلیوں کی زَد پہ تھا محفوظ آشیاں اِن آنسوؤں نے آگ لگائی تو جَل اُٹھا

اُس کا در مِل گیا تو اَے ناداں! زندگی بھر رہے گی سَر کی تلاش

جس کو حاصل ہو ترے دَر کی طلب کا رتبہ اِک جبیں چاہیے، اُس سَر کی عبادت کے لیے

اِس تماشے میں تمہیں دیکھ رہا ہے ہر شخص خود تماشا نہ بنو محوِ تماشا ہو کر

مجھ کو بھی اپنی اِطاعت کی خدائی دیدے خاک کے ڈھیر کو نمرود بنانے والے

کِدھر جائیں نِکل کر بے خودی سے حصارِ آسماں بندِ خودی ہے

فارسی فردیات

در جهانِ آب و گِل از آشنائیَ دُور باش!
گر بخواهی زیستن، از خویش هم بیگانه شو

—○—

صُورتِ پروانه ام تو خاک کن
باز می گویم که قِصّه پاک کن

—○—

هر شاخِ گُل زجوشِ بهاراں خمیده ایَ
چه خوش بهارِ غُنچه و گُل را دمیده ایَ

○

ہندی فردیات

بَیری جِیون کرے تپاس   پھُول کِھلیں تو آئے باس

—○—

دُکھ سکھ کی کیا بات سکھی   گزری سو گزران ہوئی

—○—

سوندھی سوندھی نکلے باس   کون سا گُل ہے گوری پاس

—○—

مانجھی! چھوڑ مجھے منجدھار   میرا کوئی نہیں اُس پار

—○—

سجنا! تیری اُونچی جات   مجھ پگلی کی کیا اَوکات

—○—

جس رستے سے گزرے گوری لہرائے ہریالی سی   کہنے کو یوں رادھا جیسی، لگتی ہے پھلواری سی

—○—

جھَل جھَل کرتی نِکلی گوری   سُورج پر بھی چوٹ پڑی

—○—

خشک پھُولوں میں باس رہتی ہے   سانس کے ساتھ آس رہتی ہے

نظمیں، مرثیہ اور دیگر اَصناف

راوی

راوی کی زبانی سنو راویؔ کی کہانی
پلتی رہی موجوں میں سدا اُس کی جوانی

تابانیِٔ جاوید کے اسرار ہیں اِس میں
پاکیزہ روایات کے انوار ہیں اِس میں

پگھلی ہوئی چاندی ہے کہ بہتا ہوا پارا
"شمشیرِ جہاں زیب" ہے راویؔ کا یہ دھارا

ہر قطرے میں اِک قوّتِ تزئینِ گلستاں
ہر جرعے میں اِک مژدۂ تسکینِ دل و جاں

لہروں میں جو اِک جلوۂ اعجازِ بقا ہے
یہ کوثر و تسنیم کے پَرتو کی ضیا ہے

شاعر کے تخیل کو ملی تاب یہیں سے
اِقبالؔ کا شاہیں ہُوا سیراب یہیں سے

یہ نغمۂ راویؔ ہے کہ وحدت کا بیاں ہے
داتاؔ ترے دربار کا اِک فیضِ رواں ہے

دہقاں کی معیشت کے لیے ماں کی طرح ہے
لاہورؔ کے پیکر میں رگِ جاں کی طرح ہے

لاہور یکم نومبر ۱۹۷۶ سنہ ء

آپ افسانے بہت خوب لکھا کرتی ہیں
اپنے وحشی کا تو کردار سنبھالا ہوتا

تغافل سے ترے اے نازِ محمل
ترا مجنوں تماشا بن چکا ہے

حسنِ تصوّر

گُل پوش وادیاں ہوں گھنے سبزہ زار ہوں — ٹھنڈی ہَوا ہو گاتے ہوئے آبشار ہوں
پھرتی ہوں قمریاں تو کہیں سَرو ہوں رواں — فطرت کے ہر قدم پہ عیاں شاہکار ہوں
ہر گُل لُٹا رہا ہو خزانہ بہار کا — بھونرے قرارِ دل کے لیے بیقرار ہوں
بن جائے وادیوں کی فضا گنبدِ نشاط — چٹکے جو اِک کلی تو صدائیں ہزار ہوں
نرگس بھی آنکھ کھول کے دیکھے مری طرف — منظر مری پسند کے سب آشکار ہوں
چھایا ہُوا ہو اَبر، چہکتی ہوں بُلبلیں — یادوں کے کچھ غبار سرِ کوہسار ہوں
دنیائے رنگ و بُو میں نظر آئے کچھ ثبات — بے اعتباریوں میں نہاں اعتبار ہوں
رِشتہ رہے نہ گردشِ ایّام سے جمالؔ — شاعر بھی بے نیازِ غمِ روزگار ہوں

بس ان تصوّرات میں گزرے تمام رات
جگنو مری اُمید کے شب زندہ دار ہوں

لاہور ۷ مارچ ۱۹۷۳ء

ہَوا ٹھنڈی ٹھنڈی، فضا چمپئی سی — یہ منظر کہاں تھا بہاروں سے پہلے

حقیقت گماں کا تماشا سہی — محبت فریبِ تمنّا سہی

انتظار

بدمَست جھومتی ہیں صہبا صفت گھٹائیں
پھُولوں کی روشنی سے رنگین ہیں فضائیں
بُلبل کی نغمگی پر رقّاص ہیں ہوائیں
بھوروں میں بھر گئی ہیں وارفتہ خُو اَدائیں
لہجوں میں ڈھل رہی ہیں بے ربط سی صَدائیں
آگے میرا مقدر
وہ آئیں یا نہ آئیں

لاہور ۱۱ دسمبر ۱۹۷۱ء

○

جب مری ذات سے اِک فرد بھی بیزار نہیں
کیوں بھرے گھر میں یہ احساس ہے تنہائی کا
شاخ سے توڑ کے جو تم نے دیا تھا مجھ کو
حال کیا پُوچھو ہو اُس پھُول کی گویائی کا

عشرتِ خمار

موسم بہار ہے باغ پہ نکھار ہے
برگِ گُل کا پیرہن مشک کا غبار ہے
مشک کے غبار میں عشرتِ خمار ہے
عشرتِ خمار کا
ہر بشر شکار ہے

لندن۔ اگست ۱۹۸۳ء

○

ہر گھڑی میرے تصور میں چلی آتی ہو میری آغوش میں آتے ہوئے گھبراتی ہو
اِس قدر چھپتا سویدا سائے سے رفتہ رفتہ گُم ہوا دیوار میں
جیسے جُڑ جائے گا ماضی کا شکستہ جامِ جم
سُرخ ریزے چُن رہا ہوں میکدے کی خاک سے

نیا زمانہ

اب وہ گھر سے نکلی ہو گی پھول سا مکھڑا لہکا ہو گا
ہرنی جیسی آنکھیں ہوں گی پُشپا جیسا پِنڈا ہو گا
بھینی بھینی خوشبُو ہو گی صندل کا سا بھبکا ہو گا
بجلی بن کر کوندی ہو گی ہر سو شعلہ لپکا ہو گا
رنگوں کی بوچھاریں ہوں گی خوشبُو کا لشکارا ہو گا
اَب وہ باغ میں پہنچی ہو گی غُنچہ غُنچہ ہنستا ہو گا
اِس نگری کا حال سوداؔ
"دیکھ کبِیرا رویا ہو گا"

لاہور ۲۵ جون سنہ ۱۹۷۴ء

○

تیشۂ فِکر نے ماضی کو کُریدا ہو گا
ایک دِن صدیوں کے انبار لیے گزرا ہے

شدید دمہ کی کیفیت

مرغزاروں میں سانس بڑھتا ہے — سبزہ زاروں میں سانس بڑھتا ہے
ابر پاروں میں سانس بڑھتا ہے — ریگ زاروں میں سانس بڑھتا ہے

سانس تو زندگی کی زینت ہے
سانس کا روگ اِک قیامت ہے

غم کو سہنے سے سانس بڑھتا ہے — گھر میں رہنے سے سانس بڑھتا ہے
سانس کہنے سے سانس بڑھتا ہے — پھُول پہنے سے سانس بڑھتا ہے

سانس کو پی لو ٹُوٹ جائے گا
دم مصیبت سے چھُوٹ جائے گا

سانس والے سے بات کیا ہو گی — باقی ماندہ حیات کیا ہو گی
دن کو یہ حال، رات کیا ہو گی — سانس سے اب نجات کیا ہو گی

حبس مجھ میں ہے یا فضاؤں میں
سانس مجھ میں ہے یا ہواؤں میں

دَم کشی میں یہ دَم پھُلاتا ہے — سوتے سوتے ہمیں جگاتا ہے
رات بھر آریاں چلاتا ہے — کیفیت کرب کی بڑھاتا ہے

دَم کشی دَم کی ایک بیماری
کیسے دُشمن سے ہو گئی یاری

لندن
۶ر جون بروز پیر ۱۹۸۷ء

مرثیہ
جنرل محمد ضیاء الحق رح

یہ زندگی تماشہ ہے اور ہم تماشہ گر — اِس زندگی کے واسطے پھرتے ہیں دربدر
"دنیا میں آکے رہتا نہیں کوئی عمر بھر" — یہ دنیا اِک سرائے ہے سمجھو نہ اِس کو گھر

دُنیا میں آکے ہم کو تو درسِ فنا مِلا
ناپائداریوں میں زمانہ گزر گیا

نیرنگیاں دکھاتی ہے یہ گردشِ زماں — خود رَو ہے رُوز رنگ بدلتا ہے آسماں
بچ کر نظامِ دَہر سے جائیں تو ہم کہاں — خوشیوں کے ساتھ رہتا ہے انسان نوحہ خواں

گزرے گی یُونہی اور ہمیں کھا جائے گی زمیں
انجام کار زیرِ زمیں ہوں گے ہم مکیں

اِک دیدہ ور کی دیدۂ بیدار کی تلاش — ان بے ثباتیوں میں بھی غم خوار کی تلاش
"کارِ جہاں دراز" ہے خوش کار کی تلاش — اس قافلے کو پھر سے ہے سالار کی تلاش

اس قوم کو ہے نیک ہیں قائد کی ضرورت
اِس ارضِ پاک کو ہے مجاہد کی ضرورت

خدماتِ حق سے بن گئی اسلام کی فضا — خوش قسمتی تھی قوم کی آئے نظر ضیاؔ
ہر دل میں حد سے بڑھ گیا جذبے کا ارتقاِ — ہر سمت گونجنے لگی تکبیر کی صدا

جوش و خروش قوم بھی بیدار ہو گیا
یہ جذبۂ جہاد بھی قدرت کی ہے عطا

وہ صُلح جُو تھا دِین میں ایمان میں پختہ وُہ دِیدہ وَر تھا وُسعتِ اخلاق میں یکتا
مومن بھی اِس زمانے میں دیکھا نہیں ایسا اہلِ وطن کو مَردِ مجُاہد نہیں مِلا

ہر دِل میں اِک خلش ہے اچانک یہ کیا ہوا
کل تک جو شخص تھا یہاں وہ کس طرف گیا

بے سوچے سمجھے چل دیے سوچا نہیں ذرا بگڑے ہُوئے حالات کا آخر بنے گا کیا
سکتے میں قوم رہ گئی لمحوں میں کیا ہوا گم ہو گئے کہیں کہ فضا کھا گئی خلا

ایسے کہاں گئے ہو کہ واپس نہ آؤ گے
ہم رو رہے ہیں ہم کو نہ آ کر ہنساؤ گے

یہ قوم تم کو یاد کرے گی تو آؤ گے یا ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرے گی تو آؤ گے
ہر حکم پر تمہارے چلے گی تو آؤ گے دل میں وطن کی ہُوک اٹھے گی تو آؤ گے

ہم نے تو کچھ کہا نہیں پھر کیوں چلے گئے
تُم سا کوئی رہا نہیں پھر کیوں چلے گئے

گھر سب کے دل میں کر کے سدھارے خدا کے گھر ہے ناگہانی موت پہ ہر فرد نوحہ گر
محسوس یہ ہُوا ہے ہمیں بُجھ گئی سحر حیرانیوں سے پڑ گئے افکار میں بھنور

جانا تھا اِس طرح سے تو آئے تھے کیوں یہاں
معلوم تھا یہ تم کو کہ فانی ہے یہ جہاں

لندن ۲۰ اگست ۱۹۸۸ء

محترم مولانا سیّد وزیر الحسن عابدی صاحب کے منظوم خط کے جواب میں

مکرمت نامہ آپ کا پہنچا — گویا شہ پارہ شاعری کا تھا
بندشوں میں عجب مسیحائی — شعر ہیں اِک طرح کی گویائی
عقل میں جودتیں قیامت کی — فکر میں ندرتیں فراست کی
نثر کی بات نظم میں موجود — معنوی وسعتیں بھی لامحدود
حرفِ مطلب تھا استعارے میں — گفتگو رمز اور اشارے میں
اگلی تہذیب کی نشانی سی — میر[1] و غالب[2] کی خوش بیانی سی
آگہی میں وقار شاہوں کا — انکساری بطرزِ رندانہ
حرفِ جامع مزاج کا حصّہ — شرح سنیے تو قصّہ در قصّہ
شاہِ اقلیمِ علم، ہفت زباں — گفتگو جیسے انجمن کا سماں
آنکھ میں شرم ہے مروّت ہے — نفس میں غیرت و حمیت ہے

گلشنِ ارضِ پاک میں گویا!
اک مہکتا ہوا "گلِ[3] رعنا"

○

[1] مولانا میرؔ کو استاد مانتے تھے اور مرزا غالبؔ کے پرستار تھے۔
[2] "گلِ رعنا" نام کی غالب کی ایک تصنیف بھی ہے جسے تحقیق اور تصحیح کے بعد خود مولانا نے مرتب کیا ہے جو مطبع عالیہ لاہور سے طبع ہو چکی ہے

○

جناب حکیم نیّر واسطی صاحب نے میرے متعلق ایک شعر ارشاد فرمایا :

محمّد نبی خانِ جمالِ سویدا
طبابت میں یکتا حذاقت میں شیدا[1]

○

اِس شعر کے جواب میں مندرجہ ذیل شعر بذریعہ خط حکیم صاحب کو اِرسال کیا :

آسمانِ عِلم و حکمت پر جمالؔ
"نیّرِ اعظم"[2] ہیں نیّر واسطی

لاہور ۱۹۷۶ء

○

[1] اجملِ اعظم کا تخلص تھا۔
[2] سورج کو کہتے ہیں اور حکیم اعظم خان کی لکھی ہوئی نبض پر اِس نام کی ایک مشہور و معروف کتاب بھی ہے۔

فروغِ اسلام

حذاقت شعار، گرامی قدر جنرل محمد ضیاء الحق
صدر، اسلامی جمہوریہ پاکستان

کِس تیرگی میں لپٹی ہوئی تھی یہ ارضِ پاک!
ہر شخص تھا گداز کا عالم لیے ہوئے

لُطف و کرم تھا حق کا کہ پھوٹی ضیائے حق
اِسلام کے فروغ کا پرچم لیے ہوئے

لاہور، ۲۳ دسمبر ۱۹۸۳ء

جناب علی احمد صابر چشتی صاحب

اپنے وقت کے بے مثال خطاط ہیں۔ موصوف کے نظر کش حُسنِ خطاطی سے راقم الحروف بے حد متاثر ہے۔ اِس گہرے تاثر کا اظہار ذیل میں درج ہے:

ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

خطّاطِ بے مثال ہیں اور صاحبِ کمال
اِتنے حسیں حروف کہ گویائی کا دَم ہے
تابندہ نام آپ کا اِس ارضِ پاک میں
لاریب ذات آپ کی "زرتاج رقم" ہے

لندن ۱۵ جون ۱۹۸۷ء بروز پیر

مہرجہاں بیگم

جو میری بیوی ہیں اور ۳۸ سال کا ساتھ ہے۔

عبادت اور ریاضت شغل تیرا — غریبوں، بے نواؤں کا سہارا
تحمل، عدل اور انصاف تجھ میں — منور نورِ ایماں سے سراپا

لاہور ۵ فروری ۱۹۸۴ء

○

ڈاکٹر نعیم الدّین خاں صاحب

بچپن سے دوستی اور ہم آہنگی ہے۔ میرے ماموں زاد بھائی بھی ہوتے ہیں۔

خدمتِ خلق کے جذبات سے سرشار، نعیم — چارہ ساز ایسا ہمہ وقت ہے طیار نعیم
دردمندی تجھے اُس خالقِ اکبر سے ملی — اپنے اسلاف سے حاصل ہُوا کردار نعیم

لاہور ۵ فروری ۱۹۸۴ء

○

نواب ارشد سعید خاں

دوستی بھی ہے۔ رشتہ داری بھی ہے، ابتدائی عمر میں برسوں ساتھ رہا ہے، اب بھی جب کراچی جانا ہوتا ہے، ملاقات ہوجاتی ہے، ماضی کے دُھندلے سے نقشے سامنے آجاتے ہیں۔

تاجدارِ عیش و عشرت خسروِ شیریں مقال — خوش بیانی خوش مزاجی میں کہاں تیری مثال
حلقۂ احباب میں گلدستۂ باغ و بہار — اور تنہائی میں اک تصویر ہے محوِ جمال

لاہور ۵ فروری ۱۹۸۴ء

اپنی بیٹی اشیمہ نبی کے لیے

نکتہ رسی بھی فکر میں دانش کیساتھ ہے
قدرت کی اِس عطا پہ خرد کا شعور دنگ
اوصاف ہیں، یہ بیٹی اشیمہ میں موجزن
باغِ جہاں میں پھول کھلائے گی رنگ رنگ

لندن، ۲۷ اگست ۱۹۸۵ سنہ ء

○

عزیزم علی سرفراز عابدی کے لیے

ترا علم و ہنر زیبائشیں بخشے گا ہر گُل کو
خرد کا رنگ تزئینِ گلستاں سے عیاں ہو گا
سما جائیگی اک دن بوئے رعنائی فضاؤں میں
یہ غنچہ رفتہ رفتہ آبروئے گلستاں ہو گا

لاہور، ۲۱ مارچ ۱۹۷۴ سنہ ء

○

حکیم عبید الرّحمان خان نوّر اللہ مرقدہٗ

جو میرے بچپن کے دوست، قدامت اور روایت کی منہ بولتی تصویر تھے۔

ترے کردار میں اِک جذبۂ اِخلاص تابندہ
ترے دَم سے ہے عظمت آج بھی عہدِ گزشتہ کی
بدلتے دَور میں اجداد کا انداز قائم ہے
نشانی رہ گئی یہ آخری تہذیبِ رفتہ کی

کراچی ۵۔جنوری ۱۹۸۰ء

○

بشیر موجد صاحب

میرے جگری دوست، نامور مصوّر، مایہ ناز مجسمہ ساز۔

تیرے تیشے میں نہاں عظمتِ فن کا جوہر
تیرے انداز کا اِس دَور میں فنکار نہیں
ایسے فن کار کی جس کوہ پہ جم جائے نظر
بُت کو پتّھر سے نکلنے کا خود آجائے یقیں

لاہور یکم دسمبر ۱۹۷۹ء

○

دشت میں ٹھوکریں کھاتا رہا دیوانوں کی
سنگ بُتخانے میں پہنچا تو صنم کہلایا

—○—

عشق بے مایہ سہی، نخوتِ پندار تو ہے
اس زمانے میں کوئی صاحبِ کردار تو ہے

تہنیت[1]

بتقریبِ شادی عزیزم شبیر احمد خان

چہک رہے ہیں گلستانِ آرزو میں طیور
نویدِ عشرتِ پیہم سنا رہی ہے صَبا
لدے ہوئے ہیں اُمیدوں کے پھُول شاخوں پر
طرب فزائے تمنا ہے شوخیٔ لالہ
جہانِ ناز ہے بُلبل، نیاز مند ہے گُل
نوائے کیف میں غلطاں ہے دو دلوں کی صَدا
ہمک رہا ہے رگِ تاک میں سرورِ نشاط
جھلک رہی ہے نگاہوں میں مستیٔ صہبا
لباسِ سُرخ میں سیما[1] گلاب کی صُورت
فضائے شوق میں بکھرا ہوا ہے رنگِ حیا
بندھا جو سہرا تو شبیر[2] بن گئے نوشہ
وقار آگیا طرے میں بادشاہوں کا
ہزار خوشیوں کی، یہ اِک خوشی مُبارک ہو
نئی بہار، نئی زندگی مُبارک ہو

[1] دلہن کا نام
[2] دلہا کا نام

شفاء الملک (مرحوم) کی یاد میں

راہِ ہستی کا یہ دستُور مقدّر ہے جمالؔ
نقش رہ جاتے ہیں انسان گزر جاتا ہے
جب چمکتے ہیں اندھیرے میں وہ نقشِ ہمہ رنگ
پھر کسی فرد کی عظمت کا خیال آتا ہے
اس چمک سے جو نکلتی ہے حذاقت کی کرن
جذبۂ خدمتِ انسان نمو پاتا ہے
رفتہ رفتہ یہ نمو قلب کی گہرائی میں
یومِ قرشیؒ کی ضیا بن کے سما جاتا ہے

لاہور ۶ دسمبر ۱۹۷۸ء

○

لہ شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی مرحوم و مغفور

حکیم آفتاب احمد قرشی مرحوم کی یاد میں

تاریخِ وفات ۱۶ دسمبر ۱۹۸۱ء

آباد تھا برسوں سے وہ راوی کے نگر میں
وہ دوست تھا ہم سب کا رفاقت میں تھا یکتا
وہ قوم کے ہر فرد کا تھا مونس و ہمدم
وہ خَلق کی خِدمت کے لیے پَیدا ہُوا تھا
وہ پَیکرِ اِخلاص، سیاست کا مدبّر
خُود اپنی حذاقت سے تھا حکمت کا مسیحا
ہم سمجھے کہ تا حَشر رہے گا وہ سلامت
نا جانے کدھر لے گیا اِک جھونکا فنا کا
سچ پُوچھو تو ہم کچُھ بھی نہیں دارِ فنا میں
یہ زندگی بھی وہم ہے اور واہمہ دُنیا

لاہور ۲۵۔ دسمبر ۱۹۸۱ء

وفات کی تاریخیں

مولانا وزیر الحسن عابدی مرحوم و مغفور جن کے مشوروں کی بدولت رعنائیِ خیال ضیا پاش ہوئی۔

وفات ۲۸۔ اگست ۱۹۷۹ء مطابق شوال ۱۳۹۹ھ

ہر پھول کی مہک ہے مگر یاسمن نہیں
"محرابِ گلستاں میں وزیر الحسن نہیں"

۱۳۹۹ھ

○

خواجہ محمود احمد خان مرحوم خلف الرشید خواجہ محمد احمد خان مرحوم دہلوی، جو میرے جگری دوست تھے اور بہنوئی بھی ہوتے تھے۔

اِس فنا کارِ باغِ ہستی میں مرگ اِک مقتضائے قدرت ہے
ڈھونڈتی پھر رہی ہے کس کو صبا وہ گُلِ تر "غریقِ رحمت ہے"

۱۹۷۳ء

○

بادشاہ جہاں بیگم

والدہ مرزا خیر الدین خورشید جاہ دہلوی

عفّتِ خسرواں، میہمانِ بہشت
"بادشاہِ جہاں، کامرانِ بہشت"

۱۳۹۱ھ

ترتیب